سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو شمارہ (۱۷)

افسانے

از

رشید قریشی

۱۹۳۸ء

اول — مطبوعہ — قیمت

مکتبۂ ابراہیمیہ مشین پریس حیدرآباد دکن

اِدارۂ ادبیاتِ اُردو کی دُوسری مطبُوعات

مرقع سخن (جلد اول)

مرقع سخن (جلد دوم)

سراجِ سخن

ایمان سخن

فیض سخن

بادۂ سخن

[illegible] سخن

ورڈز ورتھ اور اسکی شاعری

ٹیگور اور انکی شاعری

یوسف ہندی قید فرنگ میں

ہوش کے ناخن (ڈرامہ)

نذرِ ولیؔ

نقد سخن

گریہ و تبسم

مشاہیر قندھار دکن

انتساب

اِدارۂ ادبیاتِ اُردو کے نام

جس کی علمی و ادبی سرپرستیاں سب رس ہیں۔ اور جس کی
دستگیریوں کے سہارے ہر قسم کی علمی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں

رشید قریشی

ہائے نظرِ عمادی کی نرگسی آنکھیں . . . . . ظلمت کی ترقی میں بس .

فہرست

		صفحہ			صفحہ
۱	دکھی دل	۱۷	۷	طالب علم	۴۷
۲	ردِ عمل	۳۲	۸	غلط فہمی	۵۶
۳	بدلہ	۳۳	۹	دیر	۶۰
۴	میں اور وہ	۳۶	۱۰	ماںتا	۶۶
۵	کھڑکی کے نیچے	۴۲	۱۱	عشقِ خوش انجام	۷۲
۶	ایک پیسہ	۴۴	۱۲	مشعلیں	۷۹

		صفحہ			صفحہ
۱۳	دعوت	۸۴	۱۸	واٹر پروف	۱۲۲
۱۴	غریب کی زندگی	۹۰	۱۹	جھٹکے والا	۱۲۸
۱۵	بیوہ	۱۰۳	۲۰	شرارت	۱۳۳
۱۶	اب میں نے جانا ہے	۱۱۰	۲۱	استعجاب	۱۳۷
۱۷	ہم سفر	۱۱۷	۲۲	فریب نظر	۱۴۱

دیباچۂ عمومی

یہہ بھی ادارۂ ادبیات اُردو کے سلسلۂ مطبوعات کی ایک کڑی ہے۔
اس سے پیشتر سولہ (۱۶) کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

اس کے مصنف رشید قریشی ادارہ کے اُن نوجوان خدمت گذاروں میں سے ہیں جن میں جذبۂ عمل کے ساتھ ذوقِ ادب بھی ودیعت کیا گیا ہے، اور اگر وہ اسی طرح خاموش کام کرتے جائیں تو اپنی زبان اور ادب کی اچھی خدمت کرسکیں گے

یہہ ان کی "من کی دنیا" ہے ـــ کسی نوجوان کی من کی دنیا اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتی ہے ـــ نوجوان کو تن کی دنیا سے کیا تعلق ؟ عنفوانِ شباب کی رعنائیاں بہت کم موقع دیتی ہیں کہ "سوز و مستی اور جذب و شوق" کے سوا کسی اور طرف توجہ کی جائے !

اِس مجموعہ کا مطالعہ کرنے والے تن کی دنیا کو (جس میں بقول اقبال "سود و سودا مکر و فن" کے سوا کچھ بھی نہیں) تھوڑی دیر کے لئے بالکل بھول جائیں گے کیونکہ اِن افسانوں میں زیادہ تر ایک نوجوان کی "خیال کی بستی" آباد ہے۔ اِن میں سے اکثر شباب کی تفسیریں ہیں۔ ان میں سوز ہے، مستی ہے، جذب ہے، شوق ہے، اور کہیں کہیں شاید وہ "یک گونہ عریانی" بھی ہے جس کو آج کل "شبابیات" کے نام سے، بدقسمتی سے، اُردو ادب میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوتی جارہی ہے

"گریہ و تبسم" کی طرح "من کی دنیا" کی اشاعت سے بھی ادارہ کا یہہ مطمح نظر واضح ہوجائے گا کہ ادارۂ ادبیات اُردو جہاں قدیم اور گذرے ہوے ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں کو بے نقاب کررہا ہے، نئے نئے شاعروں اور

ادیبوں کے نورس رشحاتِ قلم کو بھی اُردو دنیا میں روشناس کرنا چاہتا ہے۔
کیا تعجب ہے کہ اس طرح کی ہمت افزائیاں اِس خطۂ ملک کی
فن کارانہ قابلیتوں اور تخلیقی قوتوں کے جگا دینے کا باعث ہوں۔

۱۵/اکتوبر ۱۹۳۸ء

سیّد محی الدین قادری زورؔ

از

پروفیسر مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم اے - ال ال بی

اس وقت مختصر قصوں کو اُردو میں، دوسری تمام ادبی صنفوں سے زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ اور شاعری کی طرح، ہر پڑھا لکھا شخص اس پر طبع آزمائی کرنے کی طرف مائل نظر آرہا ہے۔ اس مقبولیت کا سبب ظاہر ہے۔ ہماری قدیم داستان اور قصہ گوئی کی ذہنیت کسی طرح خاموش تو نہیں رہ سکتی تھی، لیکن ہماری معاشرت کی بے پایاں مصروفیتوں میں طول طویل قصوں کے پڑھنے کے لئے وقت کم ملتا ہے۔ اسی مجبوری نے مغرب میں قصہ گوئی کے اس فن کو ترقی دی تھی، انگریزی تعلیم کی ترویج کی بدولت ہمارا ادب بھی نئے نئے اصناف ادب سے روشناس ہوا۔ ان میں مختصر قصوں کو سب سے زیادہ نمایاں جگہ حاصل ہے، ہم جو قصوں کے ہمیشہ دلدادہ رہے ہیں، ہمارے مذاق کے لئے، مختصر قصوں کی شکل میں سعی کار کے لئے ایک نیا باب کھل گیا۔ یہہ ادبی شکل غزل کی طرح ہماری موجودہ دور کی رواروی کی ذہنیت سے مناسبت بھی رکھتی تھی اسی لئے اس زمانے میں مختصر قصے بے حد لکھے جارہے ہیں۔ اور ہر شخص جو قصہ پڑھ سکتا ہے وہ یہہ بھی سمجھتا ہے کہ وہ لکھ بھی سکتا ہے۔

مختصر قصہ پڑھنے میں جسقدر آسان معلوم ہوتا ہے، لکھنے میں اسی قدر مشکل ہے۔ بعض وقت ٹالسٹائے کے حد سے زیادہ سادہ قصوں کو پڑھ کر میرے دل میں بھی خیال پیدا ہوا کہ اس طرح کے قصے میں بھی آسانی سے لکھ سکتا ہوں، لیکن جب قصہ ختم ہوا تو پتہ چلا کہ اس استاد فن کی معنوی نزاکت اور اسلوب کی سادگی پر شاید مجھے کبھی دست رس حاصل نہیں ہو سکے گی۔

اس کے باوجود اُردو میں، آج کل مختصر قصے ہی زیادہ لکھے جارہے ہیں اور ان میں بعض خاطر خواہ دلچسپ اور بلند پایہ بھی ہوتے ہیں۔ اس کا ایک سبب تو یہہ ہے کہ اچھے قصوں میں نوے فی صد ایسے ہوتے ہیں جن کے خاکے مغربی شاہکاروں سے اڑائے ہوئے ہوتے ہیں، گویا ہمارے اچھے مختصر قصہ نگاروں کا

کام اس زمانے میں، زیادہ تر مغربی قصوں کو اُردو کا جامہ پہنا کر کیا ہے۔ اور اس کام کو بعض مشہور قصہ نگاروں نے قابل تعریف طریقہ پر انجام دیا ہے۔

طبعزاد مختصر قصے بھی لکھے گئے ہیں لیکن ان میں اچھے قصے، ماخوذ قصوں کے مقابلے میں بہت کم ہیں، صرف چند مسلم اور سربرآوردہ مختصر قصہ نگار ایسے ہیں جن کی قابلیت عام سطح سے بلند تر ہو سکی۔ اور وہ ایک خاص رنگ کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔ ہماری مخصوص زندگی کے بے شمار گوشے ایسے ہیں جن کے مختلف پہلوؤں پر ایسے ایسے کامیاب قصے لکھے جا سکتے ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ لکھنے والے اس فن کا خاص مذاق رکھتے ہوں۔ موجودہ زمانے کے بے شمار مختصر قصوں میں سے شاید چند ہی ہمارے ادب میں لازوال زندگی حاصل کر سکیں گے۔

رشید قریشی کے قصوں کے متعلق یہہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ یہہ تقریباً سب کے سب ان کے طبعزاد ہیں۔ اسی لئے یہہ ہماری زندگی کے نقشے معلوم ہوتے ہیں ان قصوں کے مطالعہ کرنے والے رشید صاحب کے مشاہدے، انتخاب اور پیش کشی کے انداز کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ حقیقت میں رشید قریشی کو اس شعبۂ ادب سے خاص لگاؤ ہے اور اسی لگاؤ کا نتیجہ ہے کہ وہ دلچسپی کے نئے نئے موضوع تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اور جب موقع ملتا ہے ان کو وہ قصے کے پیرایہ میں لکھتے جاتے ہیں۔ اس طرح کے کئی قصے اب تک وہ لکھ چکے ہیں۔ جن میں سے چند مختلف رسالوں میں شایع ہوتے رہے ہیں۔ انہیں افسانوں میں سے انتخاب کرکے وہ ایک چھوٹا سا مگر نفیس مجموعہ شایع کر رہے ہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ اہل ذوق اصحاب ان قصوں کو بہت پسند فرمائیں۔ مجھے توی توقع ہے کہ رشید قریشی صاحب کو قصوں کے لکھنے میں یہی انہماک اور دلچسپی رہی تو وہ جلد اُردو کے اچھے قصہ نگاروں میں جگہ حاصل کر لیں گے۔

عرض حال

خود افسانہ نگار کے متعلق اس کے افسانے پڑھنے ہی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ میں اپنے تعارف کے لئے اپنے افسانوں کو پیش کرتا ہوں لیکن چند اور باتیں رہ جاتی ہیں جن کا اظہار نہایت ضروری ہے۔

اول تو یہ کہ یہ مجموعہ میری پہلی ادبی کوشش ہے۔ فنی اور دوسرے نقاطِ نظر سے شاید اس میں کئی خامیاں دکھائی دیں گی، میں چاہتا ہوں کہ جس وقت آپ ان غلطیوں اور فروگذاشتوں سے دوچار ہوں تو میری "پہلی کوشش" کا خیال آپ کے دماغ میں رہے۔

میرے جتنے بھی افسانے شایع ہو رہے ہیں وہ میرے محسوسات کے ترجمان ہیں جو وقتاً فوقتاً میرے دل پر طاری ہوتے رہے زیادہ موزوں ہوتا اگر اس مجموعے کا نام "میرے من کی دنیا" رکھ دیا جاتا۔ اس مجموعے میں میرے دل کی دھڑکنیں محفوظ ہیں میرا دل اگر خود ستائی پر محمول نہ کیا جائے تو شیشہ سے زیادہ نازک ہے اور مختلف اور متضاد جذبات کا آماجگاہ بنا رہتا ہے، میں نے جو کچھ بھی لکھا وہ دل کے اشارے سے اور ع دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ میں اس کی مقبولیت کے خواب دیکھنے میں حق بجانب ہوں۔

شایع کرنا لکھنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ عالیجناب ڈاکٹر زورؔ مدظلہ کی علم پروریوں کے سائے میں میری ادبی صلاحیت نے پروان چڑھنا شروع کیا۔ اور آپ ہی کی پیہم تنبیہوں، اصلاحوں، اور شاگرد نوازیوں سے میں اس قابل بھی ہوا۔ آپ کی نوازشیں جو ہر ہر قدم پر میری دستگیری کرتی رہتی ہیں اس مشکل کام یعنے اس کی اشاعت میں بھی میری معاون رہیں، آپ کی علم پروری اور ادب نوازی کی ایک ادنیٰ صورت اس کتاب کی اشاعت ہے آپ اپنے شاگردوں کے کتنے ہمدرد اور خیر خواہ ہیں اس کا اندازہ الفاظ کے

ذریعہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں طبعاً سہل انگار واقع ہوا ہوں آپ نے مجھے اپنے سامنے بٹھا کر لکھوایا اور اپنے قیمتی مشوروں سے کبھی دریغ نہ فرمایا خوش قسمت ہے وہ انسان جسے آپ جیسے علم دوست اور فاضل استاد کا فیض صحبت اور سرپرستی حاصل ہو۔

نیز ماہ نامہ "سب رس" کا بھی بیحد ممنون ہوں کہ اس نے میرے افسانے شائع کرکے مجھے اپنے ناظرین سے متعارف کیا اس مجموعہ میں اکثر و بیشتر افسانے سب رس کے مختلف شماروں میں شایع ہو چکے ہیں لیکن اس مجموعہ میں شریک کرنے وقت ان میں بہت کچھ اصلاح و ترمیم کر دی گئی ہے۔

نظر ثانی اور اصلاح کے لئے میں مولانا عبدالقادر صاحب سروری پروفیسر اُردو کا احسان مند ہوں اگر صاحب موصوف کی نظر عنایت نہ ہوتی تو افسانوں کی جو بھی حیثیت ہوتی وہ صرف میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔ آپ کا شمار ہندوستان کے ان چوٹی کے ادیبوں میں ہوتا ہے جن کی تحریریں عالمانہ مزاح کی چاشنی لئے ہوتی ہے، آپ کے مشوروں سے میری تحریر بھی کچھ مزاح کی طرف مائل ہو گئی۔ بعض افسانے بالکل اسی رنگ میں لکھے گئے ہیں۔ دوسرا مجموعہ جو انشاء اللہ جلد ہی شایع ہونے والا ہے مزاحیہ افسانوں پر مشتمل ہوگا۔ افسانوں کے متعلق مجھے صرف یہی کہنا ہے کہ وہ بالکل میرے ہیں۔ ردعمل جو جو سلسلۂ داستان گو میں شایع ہوا تھا۔ اس کے متعلق رسالہ جامعہ نے نہایت ہمت افزا تنقید کی تھی بعض افسانوں میں الفاظ خیال کی تیزی کا ساتھ نہ دے سکے پڑھنے والے کو، تاوقتیکہ دماغ پر کچھ زور نہ دے لطف نہ آئے گا۔ یہ "من کی دنیا" کیا ہے؟ کیسی ہے؟ آپ کو اس کی سیر کے بعد معلوم ہو جائے گا، آپ دیکھیں گے کہ اس دنیا میں بھی فراق، محبت، وصال، کشمکش، امیری غریبی، شوخی، شرارت، دھوکہ، فریب، بوالعجبی اور حماقت سب کچھ موجود ہے۔ یہ دنیا آپ کی دنیا سے زیادہ مختلف نہیں بلکہ اس کا پرتو کہا جائے تو بہتر ہوگا ؎

دل کی ہر کروٹ پہ اک دنیا بنی اک مٹ گئی ہائے ان دو خون کے قطروں میں کتنا جوش تھا

رشید قریشی

۱۵ ر اکتوبر ۱۹۳۸ء

دُکھی دل

چاندنی رات اور پھر تنہائی - دل کی چوٹیں جتنی بھی ابھر نہ آئیں کم ہے - اُسے اپنی گزشتہ چاندنی راتوں کی یاد آنے لگی - وہ راتیں جو کسی رشک مہ کے سامنے صرف ایک "ہاں" کے لئے آہیں کھینچتے گزر جاتیں --- آہ وہ راتیں --- اس کے دل میں درد سا اٹھا اور وہ ٹہلنے لگا --- چاندنی دودھ کی طرح چٹکی ہوئی تھی --- ایسی ہی دلکش جیسے کسی نازنین کے سفید آنچل میں چنبیلی کی چٹکی ہوئی کلیاں - اس کی نظروں میں ان عاشقوں اور معشوقوں کی تصویریں پھرنے لگیں جو اس وقت دنیا کے کسی نہ کسی گوشہ میں راز و نیاز میں مصروف تھے اس کے سینے پر سانپ لوٹ گئے --- وہ کچھ دیر اپنی حرماں نصیبی پر غور کرتا رہا --- اور پھر ایک فوری جذبہ سے متاثر ہوکر چاند کی طرف دیکھتا --- اپنے گھر سے باہر نکل گیا --- ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل گئی

شہر کی تنگ و تاریک گلیوں سے گزر کر --- جہاں شہر کی خوبصورت اور دلچسپ ترین چیزیں جمع رہتی ہیں --- جہاں گناہ پوری آزادی سے اپنے کھیل کھیلا کرتا ہے - ایک گلی کے آخری کونہ پر وہ ایک چھوٹے سے مکان کے آگے ٹھہر گیا - اس گھر میں نہ روشنی تھی --- نہ پائل کی جھنکار --- اُداسی --- سارے گھر پر اُداسی چھائی ہوئی تھی --- ایک عاشق کے چہرے کی طرح --- وہ کچھ دیر عالم تذبذب میں کھڑا سوچتا رہا --- اس کا ہاتھ زنجیر کھٹکھٹانے کے لئے اٹھتا لیکن پھر کسی اندرونی کشمکش سے مغلوب ہوکر وہ اپنا ہاتھ کھینچ لیتا بازو کے مکان سے سارنگ کی آواز اور پھر ساغر کی جھنکار بلند ہوئی - اس نے آسمان پر

نگاہ دوڑائی — چاند ابر کے ہلکے سے ٹکڑے کی آڑ میں آگیا تھا — اس نے زور سے زنجیر کھٹکھٹائی وہ زنجیر کو پکڑا کچھ سوچتا کھڑا رہا — کسی کے نیچے اترنے کی آواز آنے لگی — اور پھر دروازہ کھولا گیا — آج زہرہ خاموش اور اداس تھی — کچھ دن پہلے اس کے آنے پر وہ ہنستی رہتی دوڑتی آتی اس کی باہوں کا بوجھ بنی کوٹھے تک پہنچتی — وہ اس سے بات چیت کئے بغیر اوپر چلی گئی — وہ بھی اس کے پیچھے اوپر چلا آیا — دونوں تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ زہرہ کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔ اس کے لئے یہہ جاننا مشکل نہ تھا کہ وہ رو رہی ہے — وہ کچھ بوکھلا سا گیا ایسا کیوں ہو رہا ہے ؟ لیکن پھر اپنے آپ کو سنبھالا وہ سب کچھ سمجھ گیا۔

" خوب" اس نے حقارت سے کہنا شروع کیا۔ " اب تمھارا گھر بھی محبت کے نور سے جگمگا اٹھا — تمھیں بھی محبت کے خواب دکھائی دے رہے ہیں — خوب — بھئی یہہ دنیا بھی بڑی لطف کی جگہ ہے — روز نئے نئے تماشے دیکھنے میں آتے ہیں" — وہ خاموش ہوگیا زہرہ اور بھی سسک سسک کر رونے لگی۔ " تم اس بلا سے دور ہی رہو زہرہ میں اس محبت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تم ہی پہلی عورت نہیں ہو جو اس طرح بکواس کر رہی ہو" اس کا لہجہ ناصحانہ تھا۔ " چپ رہو ناصر۔ تم چپ رہو" زہرہ نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ " تم بہت ظالم ہو" اس کی آواز بھرا گئی وہ پھر رونے لگی۔ سسکیوں کی آواز سے ناصر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل جاتی۔ " اے مجھ سے محبت کرنے والی نہ رو تیرے رونے سے مجھے بہت دکھ ہوتا ہے" ناصر کا لہجہ طنز آمیز تھا۔ اس کی شریر آنکھیں زہرہ کی محبت کا اس کے جذبات کا مضحکہ اڑا رہی تھیں۔ " آج جیب میں کچھ نہیں ہے" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ " پھر کبھی سہی خدا حافظ" ناصر جا چکا تھا۔ زہرہ نے اپنا دل ٹٹولا۔ اس کی عمر میں ناصر پہلا شخص تھا جس نے اس کے جذبات کی ایسی ناقدری کی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ

اس کے جذبات جھوٹے ہیں ۔ اس کی محبت جھوٹی ہے آج تک اس نے یہی لفظ کتنوں کے لئے نہیں کہا۔ ؟ کتنوں کو اس جال میں نہ پھانسا ؟ اس نے آج رات کھانا بھی نہ کھایا دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتی وہ ایک دیوانگی کی حالت میں اٹھی ۔ آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھا سترہ اٹھارہ سال کی خوبصورت عورت ۔ "میں حسین ہوں" وہ سوچنے لگی ۔" مجھ سے محبت کی جانی چاہیئے ۔ میں کسی سے کیوں محبت کروں ؟" وہ تیز تیز اپنی خوابگاہ کی طرف گئی وہ " خالی " تھی ۔ اس نے اپنے نڈھال اور مضمحل جسم کے لئے مسہری کو سہارا بنایا ۔ اپنی آنکھوں کو تکیہ سے ملنا شروع کیا ۔ اسے تکیہ پر نمی سی محسوس ہوی ۔ " میں پھر رو رہی ہوں" اس نے دل ہی دل میں سوچنا شروع کیا ۔ " میں تو رونے کے لئے نہیں پیدا کی گئی ہوں میں آج تک ایسا پھوٹ پھوٹ کر نہیں روئی ۔ مگر ہاں ۔ اُس دن " اُس دن کا خیال آتے ہی ۔ ایک خوبصورت نوجوان کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگی اس کی باتیں یاد آنے لگیں اُس کی دغابازی کی یاد تازہ ہوگئی ۔" اس نے مجھے کیسا دھوکہ دیا ۔ کیسے کیسے بھلاوے دے کیسے کیسے سبز باغ دکھائے ۔ محبت کے خواب دکھائے ۔ آخر میں ۔ اس کے دھوکہ میں آگئی کم بخت میں پھر عورت نہیں رہی ۔ میں پھر کہیں کی نہ رہی ۔ اور آج یہہ دن دیکھنا نصیب ہوا"

ناصر کا خیال اُس کے دماغ پر مسلط تھا ۔ وہ اس دغاباز عاشق سے کس قدر مختلف تھا ۔ اُس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی گئیں اس کے ہونٹ کراہنے کے لئے کھلے رہے ۔ وہ سو گئی

صبح کو وہ اٹھی تو طبیعت پر ایک بوجھ سا تھا ۔ مضمحل بھی اور ساتھ ہی پریشان سی بھی ۔ باہر کے دروازہ کو کسی نے کھٹکٹایا معلوم ہوا کہ اس کے قدردان آئے ہیں ۔ اس نے کسی سے نہ ملنے کا تہیہ کرلیا ۔ اور دروازہ بند رہا ۔

ناصر کا کہیں پتہ نہ تھا ۔ زہرہ پریشان تھی ۔ وہ سمجھ رہی تھی اس کی ڈوبتی کشتی کا ناخدا

اس کی مدد کو آچکا ہے ۔ اس کو ناصر سے بڑی بڑی امیدیں تھیں ۔ اس نے دو دن اس کا انتظار کیا اور تیسرے روز خود اس سے ملنے کے لئے اپنے گھر سے چل پڑی ۔

چند دنوں سے ناصر ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھا ۔ اُسے زہرہ کی صحبت میں یقین ہو چلا تھا کہ عورت محبت کرنے کی چیز نہیں ایک خوبصورت کھلونا ہے ۔ جس سے مرد کھیلتا ہے اور اس کے آگے وہ کسی بات کا قابل نہ تھا ۔ زہرہ کا خیال آتے ہی ۔ وہ بیکل سا ہو جاتا ۔ " دنیا میں سب ہی محبت کرنے والے ہیں" وہ اپنے دل سے پوچھتا " زہرہ جیسی عورت بھی محبت کرنے کے لئے تو ۔" وہ آہ بھر کر چپ ہو رہا ۔ " ہاں محبت کرنا تو اُسے چاہئے تھا ۔ نجمہ کو" وہ جوش میں آگیا ۔ " وہ زہرہ سے بھی گئی گزری ——— اس نے مجھ سے محبت کیوں نہ کی ۔ زہرہ کے نزدیک میں محبت کے قابل ہوں ۔ اور اس کے نزدیک نہیں ۔ اس نے مجھے دھوکا دیا ۔ عورت کا دوسرا نام شاید دھوکہ ہے ۔ اور وہ جس قدر خوبصورت ہوگی اسی قدر تباہ کن اور مہلک ۔" اس کی پیشانی پر شکنیں پڑگئیں ۔ سوچنے لگا " میں نے اس کے لئے کیا کچھ نہیں کیا ۔" پھر وہ آپ ہی آپ تردید کر دیتا " نہیں ۔ میں نے کچھ نہیں کیا کیا یہی کہنا کہ میری جان تم پر سے نثار ہے ۔ کچھ کرنا ہے ۔ یہ تو لفاظی ہے ۔ خود میری محبت جھوٹی تھی ۔ مجھے دیوانہ ہو جانا چاہئے تھا ۔ مر جانا چاہئے تھا ۔ میں اب بھی زندہ ہوں ـــ جینے کا لطف اٹھا رہا ہوں ۔ خیر کچھ بھی ہو ۔" اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا ۔ " میں اِن بکھیڑوں میں نہ پڑوں گا ۔ نجمہ اتنی کوششوں کے بعد جب دوسرے کی ہوگئی تو اب زہرہ تو زہرہ ہی ہے ۔"

" زہرہ مجھ سے محبت کرے گی ۔ محبت" اس کی انگلیاں بالوں کو الجھا رہی تھیں اور وہ زہرخند کر رہا تھا ۔

دروازہ آہستہ آہستہ کھلتا گیا۔ ناصر کے سامنے زہرہ کھڑی تھی۔ رنج و غم اس کے چہرہ سے ٹپک رہا تھا۔ اس نے ناصر کو رحم طلب نظروں سے دیکھا۔ ناصر نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "آؤ اندر آؤ۔" وہ نہایت سنجیدگی اور خاموشی سے اندر چلی آئی۔ "تم کیوں نہیں آئے" اس نے ابرو سکیڑ کر پوچھا۔ ناصر خاموش تھا۔ زہرہ نے اس پر اپنی نشیلی نظریں جما دیں۔ "مجھے اس طرح نہ دیکھو۔ زہرہ۔ مجھے کچھ ڈر ہوتا ہے" ناصر نے رکتے رکتے کہا۔

"تم مجھ سے ڈرتے ہو۔ اور شاید نفرت بھی کرتے ہو۔ ساری دنیا مجھ سے نفرت کرتی ہے۔" زہرہ کی آواز بھرا گئی۔ اس نے آنچل سے اپنا چہرہ ڈھانپتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے اپنی پہلی حالت میں دیکھتے تو کیا اسی طرح نفرت کرتے۔ میں کیا تھی۔ اور کیا ہو گئی۔ میں اب یہ ذلت اور برداشت نہیں کر سکتی۔ میں کسی کے قدموں میں اپنی زندگی نچھاور کر دینا چاہتی ہوں" "تم مجھے ٹھکرا رہے ہو۔" اس کی آواز بلند ہونے لگی۔ "تم ہی جیسے ایک مرد نے مجھے تباہ و برباد کیا۔ میں تم ہی کو مجرم گردانتی ہوں۔ تم محبت کرنا سکھاتے ہو اور انجان بن جاتے ہو۔ جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔ آگ کو سلگا کر شعلوں سے دور بھاگتے ہو۔ میں اب آخری فیصلہ سننے آئی ہوں۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ کیا تم مجھ سے محبت کر سکتے ہو۔" "میں تم سے محبت کر سکتا ہوں یا نہیں؟ کیا تم یہی جاننا چاہتی ہو۔؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "ہاں" زہرہ نے یقینی لہجہ میں جواب دیا۔ "تو یہ محبت کیا چیز ہوتی ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ زہرہ نے اپنی تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں جانتی محبت کس چیز کو کہتے ہیں۔ میں صرف یہی چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے قریب رہو۔ اور میرے رہو۔" ناصر سوچ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس کے جذبات کا آئینہ دار تھا۔ زہرہ نے اس کے

چہرہ میں اپنی کامیابی کے نقوش دیکھ لئے ۔ وہ آگے بڑھی ۔ ملتجی لہجہ میں کہا "میرا دل بہت دکھا ہوا ہے ۔ بہت ۔ دکھا ہوا ہے ۔ ناصر:" میرا دل بھی بہت دکھا ہوا ہے زہرہ شاید تم سے زیادہ" زہرہ کی گویا کسی نے کمر توڑ دی ۔ کسی نے ٹھوکروں سے کچو مر نکال دیا اس نے اب زیادہ اصرار فضول سمجھا اور" میں تمھیں مجبور نہیں کرتی مجھے کوئی حق بھی نہیں ہیں کون ؟ میں معافی چاہتی ہوں میں نے تمھیں بہت دکھ پہنچایا" کہتے ہوئے وہ جانے کے لئے پلٹی ۔ مگر وہ دو چار قدم ہی گئی ہوگی کہ اسے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی ۔ وہ بے اختیار رک گئی ۔ دو مضبوط ہاتھ اس کے شانوں کو مس کر رہے تھے ـــــ دنیا ناصر پر انگلیاں اٹھائے گی ۔ لیکن اسے ایک دکھے ہوئے دل کو سکھی بنانے میں ساری دنیا کی مخالفت کا ڈر نہیں

——— ٪ ═══ ٪ ═══ ٪ ═══ ٪ ———
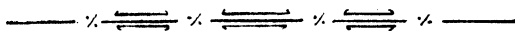
رَدِّ عمل

چند دنوں سے گھر میں نہ وہ شور وغل ہے اور نہ وہ چیخ پکار۔ ہر شخص ہے کہ اپنے کام میں مصروف....... اور تو اور خود اماں جان بھی کسی فکر میں کھوئی سی رہنے لگی ہیں اور بعض اوقات ابا جان سے بڑی دیر تک سرگوشی کرتی رہتی ہیں۔

میں اس تبدیلی کو، جو میرے لئے بڑی تکلیف کا باعث تھی دیکھتا تھا..... لیکن اس کا سبب کیا تھا..... اس سے میں بالکل ناواقف تھا..... میرے لئے یہہ راز ہی رہا۔

بعد میں اور بہت بعد میں یہہ معمہ میری سمجھ میں آیا۔ اور جب سمجھ میں آیا تو افسوس ہوا کہ کیوں سمجھا۔ میرے لئے یہہ لاینحل ہی رہنا تو اچھا تھا۔ لیکن میری کوششوں اور استفسارات کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ خیال تھا کہ اس راز کے معلوم ہو جانے سے الجھن رفع ہو جائے گی۔ لیکن مصیبت تو یہہ آن پڑی کہ الجھن میں اور بھی اضافہ ہو گیا اور کیسے نہ ہوتا میری شادی ہی کے تذکرے جو ہو رہے تھے۔

ابا جان اس معاملہ میں طرح دے رہے تھے۔ لیکن اماں جان کا تقاضہ حد سے تجاوز کر رہا تھا۔ سیکڑوں ہی تو دلائل پیش کئے گئے۔ کبھی کہا گیا "بچہ جوان ہے کالج میں تعلیم پاتا ہے" اور جب اس کے جواب میں والد صاحب کہہ دیتے کہ "نوکر بھی تو ہو جانے دو" تو اماں جان کے تعجب اور غصہ کی انتہا نہ رہتی اور بول اٹھتیں کہ "میں تو احمد کی شادی کر کے رہوں گی۔ اس کے سر سہرا دیکھنے کی مجھے بڑی آرزو ہے"۔

غرض میری شادی کے لئے کیا کیا ڈھنگ نہ سوچے گئے۔ اور ویسے تو ہر نا کتخدا

نوجوان کو اپنی شادی کے بارے میں کچھ کہتے سنتے شرم بھی آتی ہے اور اب صرف اتنا لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ والد صاحب نے بھی میری شادی کے جواز میں فتوے جاری کر دیا۔ اور اس کے بعد گھر کا نقشہ بدلا اور شروع ہوگئیں تیاریاں ....

مجھ سے بھی پوچھا گیا، میں نے جواب دیا (ذرا شرماتے ہوئے) "نہیں ابھی کیا ضرورت ہے" لیکن اگر آپ جو دل کی بات پوچھتے ہیں تو دل میں کہہ رہا تھا کہ "ہو جائے تو اچھا بھی ہے"۔

پر یقین مانئے یہہ "ہو جائے تو اچھا" میری زبان سے یا حرکات و سکنات سے کبھی ظاہر نہ ہوا۔ لیکن بچائے خدا ماں باپ کی باریک بیں نظروں سے کہ "دل کی" بات خوب جان جاتے ہیں ...... خیر ہماری زبانی مرضی لیئے بغیر بات چیت طے ہوگئی ....

لڑکی ہمارے قرابت داروں ہی میں سے تھی، اور آپ جانتے ہیں یہہ قرابت بیوی کو شوہر کی طرف سے کتنی لاپرواہ اور تغافل شعار بنا دیتی ہے۔ غیر ہو تو ذرا معاملہ جہاں کا وہاں رہتا ہے۔ کچھ تو اجنبیت کا خیال اور کچھ "ملے رہنے" کی مصلحت سے شوہر کی بڑی ناز برداری ہوتی ہے۔

شادی ہوگئی .... جیسے کہ سب کی ہوا کرتی ہے لیکن میرے حصے میں ایسی دلہن آئی جو بس بگولہ تھی۔

میں ذرا حساس واقع ہوا ہوں اس لئے گھر کے نقشے اور بیوی کے طرز عمل سے بہت جلد متاثر ہوگیا۔ لیکن یہہ سب کچھ کیا دھرا میرا ہی تو تھا۔ نہ اس وقت جب کہ "درد سے واقف نہ تھے غم سے شناسائی نہ تھی"۔ (یعنی شادی سے پہلے) خاموش رہتا اور نہ یہہ دن رات کی ٹخ ٹخ رہتی۔

خود کردہ را علاجے نیست، سمجھ کر اپنی شریک زندگی کے ساتھ زندگی گذارنے پر

آمادہ ہوہی گیا۔ مانا کہ وہ بدصورت ہے، پھوہڑ ہے، ذرا تند مزاج ہے، پر ہے تو میری بیوی۔ اور یہی خیال تھا کہ میری نفرت جو ان کی طرف سے میرے دل میں پیدا ہوئی تھی کسی قدر دور ہوئی۔

"انھوں" نے کتابیں درست کرنے سے انکار کردیا۔ میں نے کہا۔ "نہ کرو میں کرلوں گا!" میں نے تو یوں ہی کہا تھا۔ اور میں نے اپنی کتابیں آپ جمالیں، میرا اس کام کو اپنے ہاتھوں کرنا غضب ہی تو ہوگیا۔ کوئی کام نہ تھا جو میں نہ کرتا تھا۔ وہ تھیں اور ان کا پاندان، یا ماما سے گفتگو۔ شوہر بےچارہ دو چار میٹھی باتوں کے لئے تڑپتا ہے تڑپا کرے، ان کو کیا۔

غلطی اس میں میری ہی تھی۔ نہ میں اس وقت مروت میں آکر کتابیں درست کرتا اور نہ یہہ بارِ گراں سر پر پڑتا۔ ذرا سی بھول سے کتنی پریشانی لاحق ہوئی۔ کہہ دیتا اس وقت کہ "نہیں جی! مجھ سے یہہ کام نہ ہوسکے گا۔ کتابیں تم کو جمانا ہی پڑیں گی"۔ اور معاملہ ختم۔ کتابیں انھیں کو جمانا پڑتیں اور معاملہ اس نوبت کو نہ پہونچ جاتا۔ خود میرے دوست احباب نے کہا کہ میں نے اپنی جبلی سختی کو بیوی کے بارے میں بالکل نظرانداز کردیا ہے۔ لیکن میں نے اس شکایت کو اندر سے پان نہ آنے پر محمول کیا .... خیر۔

یہہ مصیبت ایک دو دن کی ہوتی تو کوئی بات نہ تھی۔ لیکن "ہر روز کے رونے کو کہاں سے جگر آئے"۔ کوئی آٹھ دن پہلے کی بات ہے۔ میں نے ناشتے میں عجلت کی۔ کیا برا کیا۔ آخر کالج وقت پر پہونچنا تھا۔ لیکن وہ کیا جانیں کالج اور اوقات کالج۔ اور یہہ تکلیف بھی انھیں اس لئے پہونچی کہ ماما نے رخصت لے رکھی تھی۔ پہلے تو ذرا پس و پیش کیا، اور پھر اصرار پر اٹھیں بھی تو بڑبڑاتے ہوے "مجھے جلا جلا کر خاک کر ڈالو گے" "ایک پیسے کی آمدنی نہیں، بس کالج! کالج! بھاڑ میں جائے ایسا کالج۔

میں نے اب تک جو کچھ بھی سنا تھا۔ وہی میرے لئے بہت تھا۔ ان الفاظ کے سننے کی کم از کم مجھ میں تو تاب نہ تھی۔ میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ سنئے کہتا ہوں "تم نے آج ماما کے نہ ہونے سے ناشتہ تیار کیا کیا...... گویا مر ہی تو گئیں۔ کیا اطاعت گزار بیویوں کے یہی ڈھنگ ہوتے ہیں"۔ اس کے بعد انھوں نے مزید سننے سے انکار کردیا.... اور مجھے ذرا ملائم لہجہ میں کہنا پڑا تاکہ عمل پیرا نہ ہوں۔ نہ سہی۔ سن تو لیں۔ ان کی طرف سے رخ بدلتے ہوئے میں نے کہنا شروع کیا "توبہ ہے! اماں جان نے بھی کیا بلا سر باندھ دی ہے پڑھی لکھی ہیں۔ جانتی ہیں کہ شوہر کی خدمت نہ کرنے والی بیوی کا دونوں جہان میں ٹھکانا نہیں۔ اور کل رات ہی کو تو "باوفا بیوی" کا تماشہ دیکھا ہے۔ لیکن "وہی ہم وہی نازبرداریاں ہیں" ان کے طرز عمل میں تو کوئی تبدیلی نہیں۔ خیر! وقت ہو رہا ہے۔ اب میں جاتا ہوں۔ لیکن آئندہ سے میں ایسے الفاظ کا قطعاً متحمل نہ ہوسکوں گا...... ممکن ہے کچھ کر بیٹھوں"۔

اپنے لکچر کو ختم کرکے میں نے جلدی جلدی دو چار نوالے زہر مار کئے اور غصہ میں بھرا ہوا گھر سے نکلا۔ میرے لکچر کے دوران میں انھوں نے سوائے بیزاری ظاہر کرنے کے کچھ نہ کہا تھا۔ لیکن میرے لکچر کے ختم پر صرف "جی اچھا" ان کی زبان سے نکلا۔ اغلب ہے بعد میں بہت کچھ کہہ لیا ہو۔ لیکن میں ان سے بہت دور کالج کی چار دیواری میں تھا۔

تمام دن میرے کانوں میں "جی اچھا" گونجتا رہا۔ کیا وہ سچ مچ اپنا طرز عمل بدلنے پر تیار ہے۔ کتنا دل خوش کن خیال تھا۔ لیکن میں اس پر یقین کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ ممکن ہے طنزاً کہا گیا ہو۔

کالج سے واپس ہوا۔ ڈرتا تھا کہ صبح کی خاموشی کی کسر اب نکالی جائے گی۔

میرے دل میں اس کی طرف سے معاندانہ جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ کبھی سوچتا "طلاق دے دوں" پھر خیال آتا "نہیں ماں باپ خفا ہو جائیں گے اور پھر یہ بھی ہاتھ سے جائے گی۔ اور والدین الگ ناراض......" جوں توں کر کے گھر میں داخل ہوا۔ امید تھی کہ قدم رکھا گھر میں اور ہوی نوک جھونک شروع۔ لیکن خلاف توقع وہ خاموش تھیں، ماما خاموش تھی گھر خاموش تھا۔ ایک افسردگی اور خاموشی تھی جو سارے مکان پر چھائی ہوئی تھی۔

میں دبے پاؤں اپنے کمرہ میں داخل ہوا..... حفظ ماتقدم کے خیال سے اندر سے چٹخنی لگائی اور ایک عجب قلبی اذیت میں مبتلا ہو گیا۔ میرے دل میں رہ رہ کے سوالات پیدا ہو رہے تھے "کیا مرد کو عورت کے سامنے اتنا مجبور ہونا چاہئے؟ کیا عورت کو زیبا ہے کہ وہ مرد کو اس قدر مجبور کرے؟ کیا مرد عورت سے اپنے بجا حکم کی تعمیل نہیں کرا سکتا؟" غرض اسی قسم کے کئی اور سوالات پیدا ہوئے لیکن اس کا جواب میرے پاس نہ تھا۔

لے دے کے اب ماں باپ کے پاس ہی ہماری داد فریاد ہو سکتی تھی۔ مگر وہاں تو "بہو راج" ہے۔ جب کہیں گے اپنی بہو کی طرف سے میری کچھ بھی تو شنوائی نہیں عجب بیکسی تھی میری..........

شوہریت کا گھمنڈ ٹوٹا۔ حمیت پر ایک کاری ضرب لگی.... میں نے ہتھیار ڈال دئے اور ہار مان کر ماما کو بلا کر ایک چٹھی اندر روانہ کر دی۔ چٹھی میں کیا لکھا تھا.... میں نہ لکھوں گا لیکن نہیں مجھے لکھنا چاہئے۔ مرد کی بے کسی کی بولتی ہوئی تصویر تھی۔ لکھا یہی تھا کہ "میں نے کیا کیا جو خفا ہو گئیں تم؟ ذری سی بات پر آمادۂ تکرار ہو جانا، کوئی اچھی بات ہے۔ تم کو میری باتوں سے تکلیف ہوتی ہے میں نہ کہوں گا قسم لے لو۔"

چٹھی اندر پہونچی ہی ہوگی۔ تب ہی ماما کو حکم دیا گیا کہ "کیوں صاحب کو چاء نہیں دی گی؟"

یہہ سننا تھا کہ میرے منھ سے "وہ مارا" بیساختہ نکلا۔ عورت اپنے سامنے اس مرد کو جسے ساری دنیا کی حکومت کا دعویٰ ہے اس قدر عاجز دیکھ کر خود عاجز ہو جاتی ہے۔ اس وقت اگر مرد اس کی جان بھی طلب کرے تو بے دریغ دے دے۔ عجب فطرت ہوتی ہے عورت کی بھی۔

رات آئی اور وہ بھی آئیں ان کے چہرے پر بجائے خفگی کے سنجیدگی اور ملائمت کے آثار نمایاں تھے۔ آتے ہی بولیں "یہہ آپ نے لکھا ہے؟" میں نے کہا "ہاں ..... تو پھر" اس پر وہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔ اور دھیمے سروں میں کہنے لگیں "آپ مجھے جلا جلا کر مار ڈالیں گے بھلا میں کاہے کو آپ سے ناراض ہونے چلی یہہ الفاظ مجھ تک تو نہ پہونچتے۔" یہہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی۔ وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئیں۔

میں عجب کشمکش میں تھا۔ نہ لکھتا تو معلوم نہیں کب تک روٹھی رہتیں۔ اور اب جب کہ میں نے اعتراف گناہ و شکست کر لیا ہے مجھ سے شکوہ کر رہی ہیں۔ شاید مرد کی برتری اور طاقت کو اس طرح پامال ہوتے نہ دیکھا گیا۔ سوچا کہ یہہ چٹھی کی وجہ سے ناخوش ہیں اس کا جھگڑا ہی نکال دو۔ اور آواز کو صاف کر کے کہنے لگا۔ "تم ناحق پریشان ہوتی ہو اور پریشان کرتی ہو یہہ چٹھی میں نے تمھیں تھوڑا ہی لکھا تھا۔ ماما نے غلطی سے تمھیں دے دیا۔" "مجھے نہیں لکھا تھا" انھوں نے چمک کر کہا۔ اور مجھ پر مشتبہ لیکن حقارت آمیز نظر ڈالتے ہوے چلتی بنیں۔

توبہ ہے! کیا مصیبت تھی۔ جو پہلو اختیار کرتا ناکامی ہوتی۔ جو داؤں لگاتا پٹ پڑتا میرا دل اس دنیا سے جس قدر جلد ہو چھٹکارا پانے کا آرزومند تھا میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ دیکھا آپ نے میری کمزوری کو، بےبسی کو، اور سب سے سوا بےچارگی کو۔ رات بستر پر کروٹیں بدلتے ہی گزر گئی۔ صبح کو دیکھتا کیا ہوں کہ بےچاری ماما کا حساب صاف کیا جا رہا ہے اور اس کو اجازت دے دی گئی کہ وہ کسی دوسرے کے پاس ڈیرا جائے ...... ماما چلی گئی

اس کی جگہ ایک بوڑھی ماما نے لی جو خیر سے کریہہ المنظر بھی تھی۔
میں کچھ نہ کہہ سکا ناکردہ گنہگار جو تھا۔ لیکن اس سے میرا کچھ نہ بگڑا۔ خود ان کے سر بلا آن پڑی۔ بڑھیا بے چاری، کہاں سے جوان خون لاتی۔ کہ گھر کا پورا کام سنبھل جاتا۔ خود ان کو ہاتھ بٹانا پڑا، اور کچھ دونوں کے بعد پورے باورچی خانے کا انتظام انھیں کے ذمہ ہوگیا۔ ماما اوپری کام کردیا کرتی
میرے کھانے کے انتظام نے ان کی مشکلوں میں اور بھی اضافہ کردیا..... صبح ناشتہ دیا جائے دوپہر کے لئے ساتھ دیا جائے۔ آخر مصیبت نہیں تو اور کیا تھی۔ غرض وہ مجھ سے بہت جلد تنگ آگئیں۔ اور ایک دن جب کہ دھوئیں کی وجہہ سے ان کی آنکھیں سرخ اور کپڑے سیاہ ہوگئے تھے۔ انھوں نے رکتے ہوے کہہ دیا " آپ بورڈنگ میں انتظام کیوں نہیں کرلیتے ؟ میں نے ان کی طرف تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا :-
" کیوں ؟ میں !..... بورڈنگ..... انتظام کروں..... خوب..... " وہ اتنا کہہ سن کر چلی گئیں۔
مجھے عجب کشمکش لاحق ہوئی بعض وقت بورڈنگ ہی کو بہتر سمجھتا کہ " ان " سے تو چند دن کے لئے پیچھا چھوٹے گا۔ اور بعض وقت ان کی جدائی کا خیال حوصلہ پست کیے دیتا تھا۔ غرض کوئی نتیجہ پر نہ پہونچتا۔
مشکل کے وقت ہی دوست یاد آتا ہے۔ مجھے بھی حمید کی یاد ستانے لگی اور میں دوڑا دوڑا ان کے پاس پہونچا رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے ان کو اپنی پوری رام کہانی سنادی۔ خود آپ حضرات کو میری حالت پر رحم آرہا ہوگا انھیں کیسے نہ آتا۔ انھوں نے بھی دم دلاسا دیا اور کہا " پریشانی کی کیا بات ہے۔ ذرا ہمت سے کام لو کسی چیز کی قدر اس کے قابو سے نکلنے کے بعد ہی ہوتی ہے۔ چلے جاؤ تم بھی بورڈنگ اور دیکھو پھر کیسی تمھاری خاطر ہوتی ہے "

اتنا کہہ کر حمید نے سر جھکا لیا۔ اور جب اٹھایا تو ان کے چہرے پر کسی انوکھے خیال کی وجہ تبسم رقص کر رہا تھا مجھے نزدیک آنے کے لئے کہا۔ اور میرے کان میں چپکے سے ایک بات کہہ دی...... بڑی اچھی بات تھی وہ۔

میں بھی مسکرانے لگا...... کامیابی کی سو فی صدی امید ہوگئی۔ انھوں نے مجھے ایک خط دیا جس پر میرا پتہ درج تھا لیکن تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ یعنی نام سے پہلے لفظ "پیارے" کا بھی اضافہ کر دیا گیا تھا۔

میں نے خط کو پڑھنے کی اجازت لی اور جب پڑھ چکا تو میرے دماغ میں گویا مسرت کا سمندر موجزن تھا۔ میری باچھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ حمید نے لکھا تھا:-

"احمد! اس وقت میری طبیعت بہت اچاٹ ہے۔ آؤ تو ذرا گاناسن آئیں...... وہ معلوم ہے پری۔ آج اسی کے ہاں چلے چلیں۔ تم پر تو وہ جان دیتی ہے۔ اور میں نے پتہ بھی اسی کے ہاتھ سے لکھوایا ہے۔ اس کی بے تابی مجھ سے نہیں دیکھی جاتی آ بھی جاؤ" فقط
تمھارا دوست

اس کے بعد حمید نے خط کو لفافہ میں بند کیا۔ اور مجھ کو سارے اونچ نیچ سمجھا دئے کہ اب اس خط کے جواب میں ایک پاک باز، محبت کرنے والے شوہر کی حیثیت سے خط لکھنا ہوگا اور یہ کہ دونوں خطوط کسی طرح میری بیوی کی نظر سے گزر جائیں...... اور بس کامیابی ہماری ہی ہوگی۔ میں نے بڑی محنت سے ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا:-

"دوست! مجھے افسوس ہے کہ تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ میرے جذبات اور خیالات کو تمھارے خط نے بہت بری طرح مجروح کیا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اپنی وفا شعار اطاعت گزار بیوی کو چھوڑ کر کسی اور پر بھی نظر اٹھا سکتا ہوں؟

میں اپنی بیوی کا ہوں کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ میرے فراق میں جو بے تاب ہیں ان سے کہہ دو کہ میں سوائے اپنی بیوی کے کسی اور سے محبت نہیں کر سکتا۔ مجھے ان کے پوجا کی ضرورت نہیں .... محبت کی ضرورت نہیں ..... میں ان کی طرف سے کسی چیز کو بھی قبول نہیں کر سکتا۔ میری بیوی، میری خدمت کرتی ہے، میری پرستش کرتی ہے۔ میرے آرام کا خیال رکھتی ہے (غلط کس قدر غلط) اس کو تکلیف پہونچاؤں ...... مجھے معاف کرو۔ میرے دوست .... "

حمید کے حسب ہدایت ان خطوط کو میں نے اچھی طرح لفافوں میں کیا۔ اور اپنی ٹوئیڈ کی شیروانی میں ڈال دیا۔

بورڈنگ جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اور آخر وہ دن بھی آپہونچا جب مجھے اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔ وہ کپڑوں کے ترتیب دینے میں مصروف تھیں ہر کام نہایت چستی سے ہو رہا تھا۔

میں نے کہا " ذرا ٹوئیڈ کی شیروانی سے کاغذات نکال کر سلک کی شیروانی میں ڈال دو۔" انھوں نے حکم کی تعمیل کی اور میں تھوڑی دیر بعد سلک کی شیروانی پہنے بالکل پابہ رکاب تھا۔

باہر پھپوں کی آواز آئی اور میں ایک الوداعی نظر ڈالتے ہوئے ...... سوار ہو گیا جیب میں اور بھی کاغذات تھے۔ اس لئے میں نے فوراً جیب پر ہاتھ ڈالا۔ میری خوشی اور مسرت کی انتہا نہ رہی۔ جب ان دو لفافوں کے سوا باقی سب کاغذات کو موجود پایا کامیابی..... سراسر کامیابی۔ انھوں نے نکالا ہوگا ان کو نکالنا چاہئے تھا۔

اپنے خاوند کی جیب میں دو لفافے پائے جائیں جن کے پتہ پر " پیارے " لکھا ہوا ہو۔ اور بیوی نہ دیکھے ...... انھوں نے بھی دیکھا اپنی حالت پر غور کیا ہوگا۔ میری وفاداری کا لحاظ کیا ہوگا

آج کل بورڈنگ میں ہوں۔ گزر رہی ہے، لیکن وہ بات یہاں کہاں ....

چند دن گزر گئے۔ کوئی غیر معمولی بات پیش نہ آئی۔ اور میں نہایت اطمینان کے ساتھ زندگی کے دن کاٹ رہا تھا۔

ایک دن کالج سے لوٹا معلوم ہوا کہ ڈاکیہ آیا تھا۔ خط کو چاک کیا ..... میری بیوی کے پاس سے آیا تھا وہ ...... گو ایسے خطوط کو راز ہی میں رکھا جاتا ہے لیکن آپ سے کون سی بات پوشیدہ ہے۔ لکھا تھا:-

"میرے سرتاج !

آپ جب سے گئے ہیں دل میں بے چینی سی رہتی ہے۔ گھر کاٹ کھانے کو آتا ہے۔ مجھ سے اس قدر خفگی کہ میں نے دل لگی سے کہہ دیا کہ " بورڈنگ جاؤ " اور چلے گئے اچھی سزا دی — وہاں آپ کو کھانے پینے کی تکلیف ہو رہی ہو گی .... بیوی جس محبت سے کھانا پکاتی ہے وہ کیا پکائیں آجائیے نا۔ مجھے آپ کا بہت سخت انتظار رہے گا اور ہاں ذرا اپنے شریف دوست احباب سے بچتے رہئیے۔"

" ہوں " میں نے دل میں کہا۔ اب آئیں راہ پر ارادہ ہے کل چلا جاؤں

مجھ سے سنئیے۔ بہتر تو ہے کہ نہ جائیے ورنہ پھر۔

بدلہ

منیر، اور نذیر کے ذہن میں یہ بات کسی طرح بھی نہ آسکی کہ ان کے ابا حمیدہ کو اتنا کیوں پیار کرتے ہیں وہ سوچتے "ہم سے عمر میں بھی چھوٹی، بازار سے کچھ خرید کر لا سکتی ہے اور نہ اسے اتنا اچھا پڑھنا ہی آتا ہے" وہ پھر سوچنے لگ گئے "وہ شاید بہت میٹھی میٹھی باتیں کرتی ہے۔ روز نئی نئی فرمائشیں کرتی ہے ......" ان کے دل میں اپنی چھوٹی بہن سے نفرت پیدا ہوگئی۔ وہ ان کے ساتھ کھیلنے کے لئے "بھیا! بھیا" کہتے ہوئے پیچھے آتی ان دونوں نے تنگ آکر کہہ دیا "ہم اب نہیں کھیلتے" مگر منیر آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ دیتا "بازو کے کمرہ میں" حمیدہ ان کا اشارہ سمجھ جاتی۔ وہ رونے لگ جاتی اور تب کہیں جاکر دونوں کا دل پسیجتا۔ کھیلنے تو دیتے مگر اس کی ہر حرکت پر دونوں کی آنکھیں لگی ہوتیں۔ اس کی ذرا سی غلطی پر دونوں آپے سے باہر ہو جاتے اسے دھمکاتے، چلے جانے کو کہتے، مگر وہ کھیل میں شریک رہتی۔ وہ بھی دوڑنا چاہتی تھی چھپنا چاہتی تھی۔ بچھونے کے اندر، باورچی خانے میں، حمام میں۔ اور جب کبھی وہ پکڑلی جاتی "نذیر پوچھتا" منیر بھائی کہاں چھپے ہیں......" "مگر میں تو چور بن گئی" وہ تعجب سے پوچھتی "تم تمہاری سند نہیں" نذیر اُسے یہ کہہ کر ٹال دیتا اور منیر کی تلاش میں کونہ کونہ چھاننے لگتا۔ حمیدہ ان کی جھڑکیاں سن سکتی تھی۔ ٹیڑھی نظریں برداشت کر سکتی تھی۔ مگر کھیل میں اس کی "سند" نہ ہو یہ اسے پسند نہ تھا...... اپنی ماں سے جاکر شکایت کی۔ اس نے الٹے اسی کو پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ حمیدہ ہر ہر جھٹکے پر اپنے منہ کو سو سو طرح بسورتی

اور بعض وقت وہ ایک جھٹکہ کے ساتھ نکل کر بھاگ جانا چاہتی ۔ اس کے منہ سے "افوہ" نکل جاتا اور وہ پھر سیدھی طرح بیٹھ جاتی ۔

پانچ بج گئے ۔ حمیدہ کے ابا کے آنے کا وقت ہوگیا ۔ اس کی کنگھی چوٹی بھی ختم ہوگئی وہ منہ ہاتھ دھو کر اٹھی ہی تھی کہ اس کے ابا نے پکارا "حمیدہ بیٹی" اور وہ تیر کی طرح ان کے کمرہ کی طرف چلی، انھوں نے اس کے ہاتھ میں مٹھائی کی پڑیا دیتے ہوئے کہا " آج تو بہت تھک گیا ہوں بیٹی ذرا پاؤں داب دے ۔" وہ پلنگ پر لیٹ گئے اور ہنستے ہوئے اپنے پاؤں حمیدہ کے گود میں رکھ دئیے ۔ حمیدہ نے پاؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا "اس میں منیر بھائی کا بھی حصہ ہے ابا ؟" " نہیں بیٹی ! وہ تجھ سے ہمیشہ جھگڑتے رہتے ہیں اس میں سے انھیں کچھ بھی نہ دینا ۔"

" ذرا چورا بھی نہیں" حمیدہ نے اپنی خوشی کو زور زور سے پاؤں دبانے میں ظاہر کیا ۔ اس کے ابا نے پوچھا " بیٹی اب میں چاہتا ہوں تیری شادی کردوں" " نہیں پہلے منیر بھائی کی کیجئے " اس نے منہ بناتے ہوئے کہا ۔ اور پھر تھوڑی دیر سوچ کر " میری شادی تو ہوگئی " " کب ؟" اس کے ابا نے فرضی تعجب سے پوچھا ۔ " مجھے نئے کپڑے پہنائے تھے .... میرے ہاتھ میں لڈو دئے تھے اچھے اچھے کھانے پکے تھے .... آپ کو یاد نہیں ہے ابا " " ارے ہاں " انھوں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا ۔ دالان میں سے دو بچوں کے زور سے پڑھنے کی آواز آرہی تھی ۔ " الف سے انار، بے سے بکری ...."

" ایکن ۲، ۲ دونی ۴ ۔" آواز تیز ہونے لگی " انار ۔ دونی، بکری، چارا" کچھ اسی طرح سنائی دے رہا تھا .... حمیدہ نے دیکھا کہ اس کے ابا کی

آنکھیں بند ہو گئی ہیں اور وہ خراٹے لے رہے ہیں تو وہ پڑیا کو سنبھال دبے پاؤں اٹھی اور دروازے میں سے جھانک کر دیکھا۔ دونوں بھائی کتابیں بند کئے دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے ایک ہی سبق کو دہراتے بیٹھے تھے۔ حمیدہ کو دیکھتے ہی منیر نے پوچھا "ب سے ؟" نذیر نے حمیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "بکری"

حمیدہ نے آہستہ سے پکارا "ابّا" پھر پڑیا کا خیال کرتے ہوئے اندر چلی آئی نذیر کی آواز اُسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ "چغلخور چور سے بدتر" اس نے ان کے لئے جلیبی کا جو چھوٹا سا ٹکڑا رکھ چھوڑا تھا وہ بھی کھا لیا۔
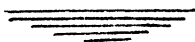
میں اور وہ

دن گذرتے جا رہے تھے لیکن وہ برابر اپنی روش پر قائم تھیں۔ایک ناسمجھ بیوی....
جسے خاوند کے دل سے کھیلنا نہ آتا ہو کتنی ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ اُف! میں چاہتا
وہ مجھے جھنجھوڑے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہے کہ "میں تم سے محبت کرتی ہوں"۔
رونے لگے...... میرے سینے کو اپنے قیمتی آنسوؤں سے تر کر دے...... افسوس اس نے
مجھے سمجھا ہی نہیں...... میں کیا چاہتا تھا اور مجھے کیا مل رہا تھا...... ایک ہمیشہ خاموش
رہنے والی عورت...... ہمیشہ کچھ سوچتی رہنے والی.... میں کیسے یقین کروں کہ وہ میرے
متعلق ہی سوچ رہی ہے۔ ممکن ہے اس کا خیال اس کے گھر کے اطراف چکر لگا رہا ہو.... میری
کسی بات پر بھی نہ ہنسنے والی بیوی مجھے صرف خاوند سمجھنے والی بیوی...... کاش اسے معلوم
ہو جاتا کہ میں اس کا عاشق ہوں۔ محبت بھرے خطوط چاہتا ہوں...... دل لگی چاہتا ہوں۔
شوخی چاہتا ہوں..... محبت چاہتا ہوں..... میں اسے چاہتا ہوں۔مگر وہ ایک مضبوط چٹان
کی طرح غیر متزلزل رہی۔سوچوں نے اس کو اپنے ساتھ بہا لے جانے کے لئے لاکھ سر پٹکا.....

کیا وہ کسی دوسرے سے محبت کرتی ہے؟ میں کانپ اٹھا۔تو پھر میں اس سے کیوں
محبت کرتا ہوں؟ دوسرے ہی کو محبت کرنے کا حق حاصل ہے۔اس نے پھر مجھ سے شادی ہی
کیوں کی؟ پہلی ہی ملاقات میں کہہ دیا ہوتا یا لکھ دیا ہوتا کہ "یوں ہے" اور میری زندگی تلخ نہ
ہوتی..... مگر وہ مجھ سے مانوس کیوں نہیں ہوتی؟ میں سوچتا رہا۔غیر شعوری طور پر میرے
قدم آئینہ کی طرف اٹھنے لگے۔میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی..... مجھے ایسا محسوس ہوا

جیسے کوئی ہیبتناک سایہ میری طرف بڑھتا چلا آرہا ہے ..... میں نے پلنگ پر لیٹتے ہوئے رضائی اوڑھ لی
اور کپکپاتا ہوا سونے کی کوشش کرنے لگا ...... سو گیا

صبح کو مجھ سے پوچھتی ہیں "کل رات والے سینما نے تو آپ کے دماغ پر بہت اثر کیا"

ہاں! ایک قابل رشک بیوی خاوند کی زندگی میرے دل پر بہت اثر کرتی ہے" ....

.... وہ خاموش ہوگئیں ..... وہ ہمیشہ ہی سے خاموش رہتی ہیں ...... ایسے جملے کہتے کہتے میں تھک چکا تھا ..... ساری کہانیاں میں نے سنا دی تھیں۔ مثلاً "ایک شخص تھا اور وہ بیوی سے اتنی محبت کرتا تھا کہ بے حد اور عورت بھی بہت چاہتی تھی .... مگر دل ہی دل میں۔ دونوں نے ایک مالی کو مالن سے چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھ لیا اور دونوں کی زندگی نئے سرے سے شروع ہوئی ..... اصلی زندگی شروع ہوئی گویا ....." میں سمجھتا کہ یہ ایک قہقہہ مارتی ہوئی اٹھیں گی اور مجھے "آؤ ہم بھی ایسی ہی زندگی گزاریں" کہتی ہوئی .... ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باغ کی سیر کو کھینچ لے جائیں گی ...... اور وہاں تو صرف "آپ نے کھانا کھایا" "آپ نے امی کے خط کا جواب دیا" "آپ سو جائیے ..... میں ذرا نماز پڑھ لوں" مجھے یہ کس جرم کی سزا مل رہی تھی۔ میرے منصوبے خاک میں مل چکے تھے ..... میرے حسب منشا جو کوئی بیوی مل جاتی تو ..... ہماری زندگی سے بہتر ایک ڈرامہ نویس کو کوئی بہتر پلاٹ نہ مل سکتا .....
محبت اور دو محبت بھرے دلوں کی دنیا اپنے اندر جن دلچسپیوں اور رنگینیوں کو رکھتی ہے وہ دنیا والوں کے سامنے بالکل انوکھے رنگ میں آجاتیں ... مگر .... ایک دن وہ اپنے کپڑے درست کرنے میں مصروف تھیں۔ میں نے نظروں سے دل کا حال بیان کرنا فضول سمجھا .....
فضول اس لئے کہ جب کبھی حسرت و یاس سے دیکھتا وہ کہتی "آپ کو کچھ تکلیف ہے" میں بیشک اپنی تکلیف ظاہر کرنا چاہتا۔ لیکن ان کی تکلیف دیکھنے کے لئے ان کو بھی بے چین کرنے کیلئے

وہ ہمیشہ غیر متاثر...... اور ساتھ ہی ہمیشہ متاثر کن بھی صندوق کو بند کرنے کے بعد وہ ایک ساڑی لیئے ہوئے پلٹیں مجھے دیکھتے ہی جھجکیں..... بھاگ جانا چاہتی تھیں "نہیں اب صبر نہیں ہو سکتا" میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔" اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا..... گویا کہنا چاہتی تھیں" یہہ انداز گفتگو کیا ہے" میں نے کہا" تم کو مجھ سے کہنا ہی پڑے گا کہ تم مجھ سے بھاگتی کیوں ہو" "کوئی پکڑنے کے لئے آئے اور نہ بھاگا جائے" اس نے پہلی دفعہ اپنے جملہ کو ہنستے ہوئے ادا کیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔" مجھ سے تم ایسی باتیں کیا کرو...... مجھ سے تم" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا...... اس نے سر کو اس طرح جھکالیا جیسے کچھ سوچ رہی ہے..... سر کو جنبش دیتے ہوئے..... اس نے کہا" اچھی بات ہے...... آپ اور کیا چاہتے ہیں" "مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔ ہاں ذرا شوخ وطرار..... بس بس" میں نے مطمئن لہجہ میں کہا۔" تو پھر آئیے آپ سے کچھ شوخی کریں" اس نے ساڑی کو میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے واقعی ذرا شوخی ہی سے کہا اس طرح کہ دل خوش ہو گیا..... "اسے پہن لیجئے..... اور پھر" میں یہہ کیا سن رہا تھا۔ ساڑی میں پہن لوں..... میں..... "چلئے جلدی کیجئے شوخی کا وقت جا رہا ہے" "اس کا کیا مطلب ہے ؟" میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔" مطلب کچھ نہیں..... بس یہی کہ تھوڑی دیر دل لگی رہے میں بھی لطف اٹھاؤں اور آپ کو بھی مزہ آئے....." اس نے ایک خاص انداز میں کہا میں نے اس کی مدد سے پہن تو لیا..... مگر یہہ کہ پانی پانی ہوا جا رہا تھا....... آئینے میں دیکھتا ہوں تو اپنی حالت پر بجائے ہنسی کے غصہ آنے لگا..... ایک تیس سالہ جوان بیڈول جسم اور بھدی ناک والا..... ساڑی میں..... خوفناک..... مکروہ..... مضحکہ خیز۔ وہ ہنس رہی تھیں..... اس طرح چیخ چیخ کر کہ آج تک کی خاموشی کی کسر نکال رہی تھیں۔

بعد میں " وہ کیا سوچ رہی ہو گی ؟" پر بہت دیر تک غور کرتا رہا آنکھیں ملاتے ہوئے بھی شرم آ رہی تھی ..... مگر .... میں نے ارادہ کر لیا کہ بدلہ ضرور لوں گا .... میں نے زبردستی اسے اپنا لباس پہنا دیا۔ بہت دیر تک تعریفی نظروں سے دیکھتا رہا ۔" تم اگر مرد بن جاؤ تو بھی . . . . .
" آپ جیسی عورت کے ساتھ میرا نباہ مشکل سے ہوگا" اس نے بھویں سکیڑتے ہوئے جواب دیا میرے دل پر گولیوں کی باڑ چل رہی تھی ..... منہ میں دھواں سا بھر گیا میں نے اس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ " تم مجھ پر بڑا احسان کر رہی ہو ....." میں نے رکتے رکتے کہا۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا ..... ان کی ایک سہیلی آئی تھیں ..... میں دیوان خانے میں چلا گیا تھوڑی دیر بعد دونوں کے قہقہوں کی آواز کانوں میں آئی۔ ان کی سہیلی نے کہا " تو اب یہ ترکیب ذہن میں آئی ہے ۔یوں بیچارے کو گھیر رہی ہیں آپ" میں دروازے کو کان لگائے سن رہا تھا ۔ بہت ہی آہستہ لہجہ میں کہنے لگیں " اس بھونڈی صورت پر یہ چاؤ ہیں ان کے" " اری آہستہ" انھوں نے اسے اندر لے جاتے ہوئے کہا " مگر تو نے کبھی میری آنکھوں سے بھی دیکھا ہے"
میں نے صوفہ پر اپنے آپ کو ڈال دیا ..... دماغ میں چکر سا محسوس ہو رہا تھا ... چیخنا چاہتا تھا رونا چاہتا تھا۔ دوڑ کر انھیں سینے سے لگا لینا چاہتا تھا ..... وہ کتنی نیک اور محبت کرنی والی بیوی ہے" میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سوچنا شروع کیا ..... اندر داخل ہوا ایک سرور سا مجھ پر طاری تھا ۔ ہر چیز رنگین نظر آ رہی تھی اور وہ تو ملاحت کا چراغ معلوم ہو رہی تھیں ۔ روشنی کی طرح ملاحت کی کرنیں پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھیں ۔آنکھیں چار ہوئیں ۔آنکھوں کی مسکراہٹ ..... وہ اٹھیں ..... میں نے کہا " ایک نئی بات کہنی ہے تم سے" "جی بس بہت سن چکی ۔ اب کوئی پرانی بات ہی سنائیے" ان کا مطلب شاید یہ تھا کہ ہم جو روز انہ انھیں اپنے عشق اور ان کے حسن کے متعلق نئی نئی باتیں کرتے ہیں وہ نہ کریں بلکہ کوئی پرانی

بغیر حسن و عشق والی۔ اور ہم اس دنیا میں پہونچ گئے جہاں عمر بھر رہنے کی ہر شخص کے دل میں خواہش ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے کی ملاقاتیں، شادی کی تیاریاں۔ شادی ... جوانی اور شادی .... "میں ابھی سوچ رہا تھا کہ وہ کھانا لے آئیں ... بال درست کر لئے گئے تھے۔ غازہ رخساروں پر چمک رہا تھا ... خوشبو میں بسی ہوئی تھیں ... گویا آج "ہم میں کچھ بھی نہ چھوڑنے" کا ارادہ کر کے آئیں تھیں۔ میں کھا رہا تھا ..... سوچ رہا تھا اور لطف اندوز ہو رہا تھا ان کا آراستہ کمرہ نظروں میں پھرنے لگا ...... کتنا ڈرتے ڈرتے .... میں نے اس کے اندر قدم رکھا تھا۔ میں نے سر اٹھاتے ہوئے کہا "یاد ہے وہ رات والی ملاقات" وہ شرما گئیں۔ واقعہ دراصل یوں تھا کہ میں نے شادی سے پہلے ان سے ملاقات کی تھی اور ایک رات کو جب وہ اپنی ماں کے پاس سے لوٹ رہی تھیں .... میں نے راستے ہی میں روک لیا۔ وہ چونکیں ..... گھبرا گئیں ..... میں مایوس ہو گیا۔ ایک عاشق و معشوق تو ایسے زریں موقعوں کے لئے دعائیں مانگا کرتے ہیں اور یہ .... گھبرا رہی ہے "نہیں آج تمھیں نہیں جانے دوں گا" میں نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ اس نے چیختے ہوئے کہا کہ "میں چیختی ہوں .... اماں کو بلاتی ہوں" میں گھبرا گیا نرم ہو گیا ..... "اچھا کم از کم میری ایک دو باتوں کا جواب ہی تو دے دو" "کیا جی"۔ اس نے تیزی سے کہا "تمھیں مجھ سے محبت ہے" "ہاں" "تم کس کی ہو" "تمھاری" "ہم کس کے ہیں" "ہمارے" گفتگو اس قدر جذباتی اور تیزی سے ہو رہی تھی کہ مجھے خود خیال نہ رہا کہ میں کیا پوچھ رہا ہوں اور کیا جواب مل رہا ہے ..... ایک گستاخی .... اور جانے کی اجازت دے دی گئی ...... اب غور کرتا ہوں تو ان کی ساری چالاکی کا راز کھل جاتا ہے۔ کس طرح انھوں نے صرف مجھے

ٹالنے کی خاطر سب کچھ کہا ...... سب کا اثبات میں جواب دیا۔ میں نے چہرہ پر درشتی پیدا کر لی "تو تم نے مجھے دھوکا دیا" میں نے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا "جی ہاں" مگر آپ نے بھی تو مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی ...... اگر آپ کی ہماری شادی نہ ہوتی تو۔ جانتی ہوں کہ نسبت ہو چکی تھی مگر کیا نسبت نہیں ٹوٹ سکتی آپ ......" "اچھا تو بہت دور کی لی تم نے" میں نے کھانا ختم کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اب تو کسی قسم کا خوف نہیں" "نہیں" ماحول نہایت رنگین تھا۔ کمرہ کی سبز روشنی رومان آفریں تھی۔ وہ پان لے آئیں ...... میں نے کہا "وہی شرارت کی ہے" وہ مسکرا دیں ...... زردہ سے مجھے بڑی نفرت ہے اور یہ قصداً ایک آدھ چٹکی زردہ پان میں ڈال دیا کرتی تھیں "آج بہت جلد نیند آرہی ہے آپ کو" "ہاں" میں نے روشنی گل کرتے ہوئے جواب دیا۔

کھڑکی کے نیچے

ہارمونیم کی آواز قریب ہوتی گئی ۔ میں نے کھڑکی کھولی اور جھانک کر دیکھا ایک نوجوان بازاری گویّا اور اس کے پیچھے ایک الہڑ کمسن دوشیزہ آہستہ آہستہ چلے آرہے تھے ۔ وہ دونوں میرے بنگلہ کے نیچے رک گئے ۔ اِدھر اُدھر دیکھا ۔ گلی سنسان پڑی تھی ۔ اِکّا دکّا راہ گیر کبھی کبھی اس طرف بھول پڑتا ۔ اس گلی میں میرے بنگلہ کا چبوترہ اُن کے لئے بہترین نشست تھی ۔ وہ یہاں بیٹھ کر ستا لے سکتے تھے ـــــــ دن بھر کی آمدنی کا حساب لگا سکتے تھے ۔ لڑکی نے اس نوجوان سے آنکھوں ہی آنکھوں میں مرضی لی ۔ اور ایک چھلانگ کے ساتھ چبوترہ کے اوپر آگئی اور اپنے ساتھی کا ہارمونیم لکالنے اور اسے اوپر رکھنے میں ہاتھ بٹانے لگی ۔ وہ بھی اوپر آگیا ۔ اپنے سر کا رومال نکال کر زمین صاف کی اور بچھاتے ہوئے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے نزدیک بٹھا لیا ۔ میں نے پٹ کو اور زیادہ بند کر لیا ۔ اس طرح کہ ایک باریک سی درازہی باقی رہی ۔ مگر اس میں سے بھی مجھے وہ صاف نظر آرہے تھے ۔ لڑکی نے گنگنانا شروع کر دیا ۔ آواز بتدریج بلند ہوتی گئی ۔ لڑکی کی آواز میں بلا کا درد تھا فنی اعتبار سے ممکن ہے اس کا گانا کچھ اچھا نہ ہو ۔ مگر سامعہ نوازی کے لئے آواز میں درد کا ہونا بہت کافی ہے ۔ وہ گا رہی تھی ؎

سارج یہ کینہ ساج کیا جانیں   ناج والے نیاج کیا جانیں

وہ نوجوان لڑکی کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا ۔ ایک شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ وہ اٹھ بیٹھا ۔ لڑکی کی طرف متوجہ ہو کر ایک اندازِ استغنا سے پوچھا "کچھ گانا بھی جانتی ہو"

لڑکی کچھ جھجکی اس کو نظر بھر کے دیکھا اور صورت حال تاڑ کر نہایت متانت سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگی۔ "جی ہجور" "کیا جی ہجور" اس نوجوان نے تیوری چڑھاتے ہوئے پوچھا " یہی استاد کی کرپا سے کچھ گانا جانتی ہوں" "اچھا کوئی چیز سناؤ" اس کے چہرے پر کرختگی پیدا ہوگئی۔ آنکھیں شرابی کی سی ہوگئیں۔ اور وہ جھومنے لگا۔ لڑکی نے آہستگی سے کہا " ہارمونیم بجاؤ" "ہوں" اس نے ڈانٹ بتائی اور لڑکی نے مسکراتے ہوئے گانا شروع کر دیا۔

تم جو چاہو تو مرے درد کا درماں ہو جائے ورنہ مشکل..............

"ٹھیرو" اس لڑکے نے روکتے ہوئے کہا۔ اور فرمائش کی "پھڑکتی ہوی ہاں۔ کوئی چلتی ہوی" لڑکی نے کچھ دیر سوچا اور پھر آنکھیں مٹکاتے ہوئے گانے لگی۔۔۔

چھوٹے سے بلما مورے آنگناں یں گلی کھیلے آنگناں یں گلی کھیلے۔ آنگناں یں گلی کھیلے"

اس لڑکے پر تو گویا جادو کیا جا رہا تھا۔ جس تیزی سے وہ جھوم رہا تھا اور جن للچائی ہوی نگاہوں سے وہ اس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا اس سے یہہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہ تھا کہ یہ اب کچھ نہ کچھ کر بیٹھے گا۔ "خوب خوب" کا اس نے نعرہ لگایا۔ اور آہستہ "واہ واہ" لڑکی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "ہجور میں کیا گا سکتی ہوں"" "نہیں نہیں۔ خوب گاتی ہو" لڑکے نے یہہ کہتے ہوئے اپنے جیب سے کچھ پیسے نکالے اور اسے دے دیا۔ لڑکی نے کئی فرشی سلام کئے اور اس انعام کو اپنے ہاتھ میں لیکر ایک زور کا قہقہہ لگایا اور اس لڑکے کے زانو پر اپنا سر رکھے ہنستی ہوئی گنگنانے لگی "ماروں گی پھلکوں کی مار" اس کے بعد دونوں نے ملکر کچھ کھایا پیا اور اب لیٹنے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ میں نے ایک زور کی کھنکار سے انکو چونکا کر دیا کچھ دیر کے بعد پھر جو کھڑکی کھول کر دیکھتا ہوں تو گلی کی موڑ پر اس لڑکے کو اپنا انعام واپس لینے کیلئے کشمکش میں مصروف پایا۔ پھر دیر تک ہارمونیم کی آواز دھیمی دھیمی آتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ فضا میں گم ہوگئی۔

ایک پیسہ

سڑک پر میوہ بیچنے والے کی گاڑی کتنی جاذب نظر اور دلکش ہوتی ہے۔ کتنے سلیقہ سے وہ ہر میوہ کو جماتا ہے۔ کیا مجال جو کسی میوہ کا داغدار یا سڑا ہوا حصہ دکھائی دے۔ طبیعت خواہ مخواہ خریدنا چاہتی ہے۔ اور ان میووں کی تازگی کو دیکھ کر منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ میوے غیر معمولی طور پر نفیس اور خوش رنگ ہیں۔ تھوڑی سی تکرار کے بعد میں نے ۲ سیب خرید لئے اور آگے بڑھنے کے خیال سے پلٹا ہی تھا کہ دو بچے چھ اور آٹھ برس کی عمر کے نہایت شوق اور تیزی سے بڑھے چلے آرہے تھے ان کے انداز کو دیکھ کر یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ وہ ساری گاڑی کو خریدے بغیر نہ مانیں گے۔ میں ٹھہر گیا تاکہ دیکھوں یہ سودا چکانے میں کتنی مہارت رکھتے ہیں دونوں میں تھوڑی دیر رد و قدح ہوتی رہی اور طے یہ پایا کہ سودا بڑا لڑکا ہی چکائے گا۔ اس خریدار نے پہلے تو سیب کو اچھی طرح دیکھا بھالا اور ایک سیب کے داغدار حصے کو میوہ فروش کی طرف پھیر کر پوچھا "اس کی کیا قیمت ہے؟" دکاندار نے ایک انداز تمسخر سے ان کی طرف دیکھا اور چپ ہو رہا۔ کیونکہ وہ ان خریداروں کی کٹ حجتی سے خوب واقف تھا۔ سیب رکھ دیا گیا پھر ان دونوں نے ساری گاڑی کا جائزہ لینا شروع کیا۔ شاید انھوں نے دکاندار کی خاموشی سے سیب کے بکاؤ نہ ہونے کا اندازہ لگا لیا تھا چھوٹے لڑکے نے سیب کی خریداری میں ایک نیا عذر پیش کیا۔

"میں سیب نہیں کھاؤں گا۔ مجھے بخار آرہا ہے" جس پر بڑے لڑکے نے جو اب تک ایک انگور کے خوشہ پر حریص نگاہیں جمائے ہوئے تھا کہا "تو پھر انگور ہی لے لیں" اور

انگوروں کے بابت بھی ویسا ہی معصومانہ سوال کیا "پیسے میں کتنے انگور؟" ایک دکاندار کو
برافروختہ کرنے کے لئے یہ سوال بہت کافی تھا۔ اس نے جھڑکی کے انداز میں ان کو
چلے جانے کے لئے کہا۔ وہ شاید اس پر تعجب کر رہے ہوں گے کہ ان کے پاس پیسہ
موجود تھا پھر اس کو انگوروں کے دینے میں عذر کیوں ہو۔ ایک پیسہ کوئی معمولی چیز نہیں۔
اس کو انھوں نے کتنے انتظار کے بعد اور کتنی مشکل سے حاصل کیا تھا۔ انھوں نے کتنی دفعہ
کہا تھا کہ " اماں ایک پیسہ دو...... اچھی اماں ایک پیسہ دو" لیکن میوہ فروش کو اسکی
کیا خبر تھی۔ میوہ فروش نے میووں پر سے دھول جھٹکی اور ان کو پرے ہٹا دیا۔ دونوں
نے فیصلہ کرلیا کہ اب وہ سیب اور انگور نہیں خریدیں گے۔ بڑے لڑکے نے کہا "بہت خراب ہیں
سیب، اور انگور بھی سڑے ہوئے ہیں۔" "میں انھیں کبھی نہ کھاؤں گا۔" چھوٹے لڑکے نے پیسہ کو
جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد ایک آخری کوشش کی گئی انھوں نے کہا کہ ایک پیسہ میں
ایک چھوٹا سا سیب اور چند انگور کے دانے مل جائیں تو وہ پیسہ دینے پر راضی ہیں۔ میوہ فروش
نے آنکھیں نکال کر ایک زور کی ڈانٹ بتائی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا۔
چھوٹے لڑکے نے شکایت آمیز انداز میں کہا "تم نے اپنا پیسہ کیا کیا اب میں تو تمھیں حصہ
نہیں دوں گا" بڑے لڑکے نے نہایت ملائمت سے اور ہنستے ہوئے کہا "وہ تو گم ہو گیا چنے والے
کی دوکان پر" اور چھوٹے بھائی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کسی دوسری دکان کا رخ کرنا چاہا جہاں
ان کو اس چیز کے سستے داموں ملنے کی امید تھی۔ میں اب تک خاموش کھڑا ان کی اس گفتگو
سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں نے میوہ فروش سے کہا "دے دو کچھ بھی۔" "اس طریقہ سے
دکانداری نہیں چلتی صاحب" اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ میں نے اپنے جیب سے ۲ چار
پیسے نکالے اور اس کے حوالے کر دیئے۔ اس نے اپنے اُن ۲ ننھے خریداروں کو آواز دی وہ

بھاگتے ہوئے آموجود ہوئے۔ میوہ فروش نے ان سے پیسہ لے لیا اور ایک سیب ان کے
ہاتھ میں پکڑا دیا۔ انھوں نے سیب کو ہیر پھیر کر دیکھا۔ دو تین سیب اور بھی دیکھے اور ایک بڑے
سیب کو دونوں نے پسند کیا۔ سیب چھوٹے لڑکے ہی کے ہاتھ میں رہا۔ بڑے لڑکے نے اپنی پتنگ
دینے کا پختہ وعدہ کیا۔ اور کہا کہ وہ آئندہ کبھی اسے نہ ستائے گا۔ اور کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا
"اب تو تمھارا بخار بھی اتر جائے گا۔" جس پر چھوٹے لڑکے نے منہ بسورتے ہوئے کہا "مگر وہ انگور۔"
بڑے لڑکے نے تیوری چڑھائی۔ اسے یقین تھا کہ سودا بہت سستا ہوا ہے اور قبل اس کے کہ میوہ فروش
کو اس کا علم ہو انہیں بہت دور پہونچ جانا چاہئے اس نے اس کو گاڑی سے پرے ہٹاتے ہوئے کہا "یہ
انگور کھٹے ہیں۔ ان سے کھانسی ہوتی ہے۔ چلو چلو۔ سیب کو ہوا لگ رہی ہے۔ لاؤ اسے میں اپنی جیب
میں رکھ لیتا ہوں۔" چھوٹے لڑکے نے سیب کو دینے سے قطعی نارضامندی ظاہر کی۔ اور اس کو اپنی
جیب میں ٹھونستے ہوئے اپنے بھائی سے آگے آگے نکل چلا۔ کیونکہ بڑے بھائی نے اس کو اپنے ساتھ
چلنے سے منع کر دیا تھا۔

مجھے اپنا بچپن یاد آ رہا تھا۔ ہر بیمار کے ساتھ میرا خود بیمار ہو جانا اور پرہیزی چیزوں میں
شریک ہو جانا میرے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔ میں نے دونوں لڑکوں کو گلی میں مڑتے
ہوئے دیکھا اور اپنی راہ لی۔ دو تین روز بعد پھر اس میوہ فروش سے ملاقات ہوئی کہہ رہا تھا
کہ وہی بچے دوبارہ آئے تھے اور خوب بحث کی لیکن خالی ہاتھ واپس گئے۔ اس دفعہ ان کے
دوست احباب بھی ساتھ تھے۔ اور ہر ایک کے پاس ایک ایک پیسہ تھا۔
میں مسکرا کر چپ ہو رہا۔ اور سیب لئے بغیر آگے بڑھ گیا۔

طالبِ علم

محبت کرنے کا مزا تو اس وقت آتا ہے جب کہ محبوب کوئی طالب علم ہو۔ نہ اس لئے کہ میں نے ایک طالب علم سے محبت کی ہے۔ بلکہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ میں اپنی اماں کے پاس بیٹھی بڑے بھائی جان کی شادی کے متعلق بات چیت کر رہی تھی مجھے نہ معلوم کیوں شادی ہی کے تذکروں میں لطف آنے لگا تھا۔ شاید سب ہی لڑکیوں کا یہی حال ہو جب پوچھوں گی تو یہی کہ " شادی کب ہوگی ...... کس سے ہوگی ..... وغیرہ وغیرہ" اماں نے میرے اس روز کے استفسار سے تنگ آ کر کہا "میں تو اب پہلے تیری ہی شادی کروں گی....." میں یہ سن کر بہت شرمائی اور اٹھ کر بازو کے کمرہ میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد بی پڑوسن آئیں اور اماں سے باتوں میں مشغول ہو گئیں۔ میرے لئے بڑی بوڑھی عورتوں کی باتیں کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں۔ لیکن آج وہ پڑوسن تو کچھ نئی نئی باتیں کہہ رہی تھی۔ اس نے کہا کہ ہمارا مکان ہمارے لئے بہت بڑا ہے اور ہم اگر مناسب سمجھیں تو دیوان خانے کے بازو کا کمرہ ان کے گاؤں کے ایک لڑکے کو جو یہاں تعلیم پانے کے لئے آیا ہوا ہے، دے دیں۔ اماں نے اپنی تشفی کے لئے کچھ سوالات کئے یہی کہ " کہیں آوارہ تو نہیں۔ پیتا کھاتا تو نہیں" جس پر اس نے کہا " وہ طالب علم ہے بی بی" گویا طالب علم ہونا نیک چلنی کی ضمانت ہی تو ہے۔ اماں نے کہا " کچھ بھی ہو تم اس کی ذمہ دار ہو" " ہاں .... ہاں آپ اطمینان رکھیئے۔ وہ میرا بچپن کا دیکھا بھالا ہے۔ بڑا شریف ہے وہ اور ......" وہ اس طالب علم کی شان میں شاید کوئی قصیدہ ہی پڑھنے والی تھیں کہ اماں نے روک کر کہا " اچھا تو ہم وہ کمرہ خالی کر دیتے ہیں

وہ جب چاہے آکر رہ سکتا ہے"۔ بی پڑوسن اتنا کہہ سن کر چلی گئیں اور اماں نے مجھے بلاکر پوچھا "کیوں تیری کیا مرضی ہے" میں نے کہا "اچھا ہے۔ یہ مکان ہم دونوں کے لئے بہت بڑا بھی تو ہے۔ بھائی جان تو یہاں آنے سے رہے ....." "ہاں میں بھی یہی خیال کرتی ہوں کہ پڑے رہے گا ایک کونے میں ....." اماں نے کہا اور مجھے اس کمرہ کو صاف کرنے کے لئے بھیج دیا۔ میں نے صاف تو کیا کیا البتہ کچھ اور ہی کچرا کوڑا ڈال آئی۔

دوسرے دن اُن طالب علم صاحب کی آمد کی اطلاع بی پڑوسن نے دی اور ان کو معہ ساماں کے ہمارے کمرہ میں اتار دیا۔ اماں نے انھیں کے ذریعے سے کہلا بھیجا کہ "کوئی تکلیف ہو تو ماما کے ذریعے اندر کہلوا بھیجیں" شاید اس شخص کو کوئی تکلیف نہ تھی کیونکہ ماما سے کبھی کچھ نہیں کہا گیا اور اسے کوئی تکلیف نہیں دی گئی۔ جو کچھ بھی کام ہوتا وہ خود اپنا آپ کر لیتا۔ چند دنوں کے بعد بی پڑوسن پھر آئیں اور اب کی دفعہ ان کے کھانے کا بھی یہیں انتظام کر گئیں۔ اماں نے کچھ لینے کرنے سے انکار کر دیا اور تین وقت کا کھانا باہر جانے لگا۔

میں نے اب تک اس لڑکے کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ رہ رہ کر یہی خیال پیدا ہوتا تھا کہ "نہ معلوم وہ کیسا ہے"۔ بس یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ یہ بات جان کر میں کروں گی بھی کیا؟ لیکن اوروں کی طرح میں بھی ہر نئے شخص کو دیکھنا پسند کرتی تھی۔ دیوان خانے میں جاکر دیکھنے کی تو ہمت نہیں ہوتی تھی البتہ اپنے کمرہ کی کھڑکی میں سے ان کو مدرسہ جاتے وقت دیکھنے کی ترکیب ذہن میں آئی۔ دس بجے کے قریب یہ کمرہ سے کھٹ پٹ کرتے ہوئے نکلے اور میں دوڑتی ہوئی اپنے کمرہ میں پہنچی۔ تھوڑی دیر بعد آپ کتابیں بغل میں دابے شیروانی کے بٹن لگاتے ہوئے نظر آئے صورت تو اچھی طرح نظر نہ آئی

لیکن ڈیل ڈول سے ان کے اچھے ہونے کا اندازہ ہو گیا۔

مجھے دن تمام کوئی کام نہ رہتا تھا۔ پڑھنا لکھنا تو بہت دن ہوئے چھوڑ دیا تھا اماں پڑھنے پڑھانے کی بہت مخالف ہیں۔ کہتی ہیں "پڑھنے سے لڑکیاں بدچلن ہو جاتی ہیں" اور پھر اس کے ثبوت میں کئی ایک لڑکیوں کی مثالیں۔ "فلاں لڑکی نے میٹرک پاس کیا اور بھاگ گئی ...... فلاں نے مڈل کیا اور بدنام ہوئی ......" میں بھی سوچتی ہوں کہ واقعی تعلیم لڑکیوں کے خیالات کو گندہ کر دیتی ہے۔ میں نے زیادہ تعلیم نہیں پائی ہے۔ چوتھی جماعت کے بعد ہی اسکول چھوڑ دینا پڑا۔ مگر اس عرصہ ہی میں کتابوں کے پڑھنے سے مجھے کئی ایک ایسی باتیں معلوم ہوئیں جو مجھے گھنٹوں اپنی دلچسپی میں گم رکھتیں۔ اور میری یہ روش بھی یہاں تک میں خیال کرتی ہوں اس تعلیم ہی کے زیر اثر تھی۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ تعلیم لڑکی کو شائستہ، سگھڑ اور بلند خیال بناتی ہے مگر آج کل کی کتابیں جس بلند خیالی۔ شائستگی اور سگھڑ پن کی تعلیم دیتی ہیں وہ شاید یہی ہے کہ لڑکی کسی معمولی گھرانے میں نہ نبھ سکے اور اپنے آپ کو سوائے اپنے جذبات اور اندھی عقل کے کسی اور کا تابع نہ سمجھے ...... ہاں تو میں نے بہت کم تعلیم پائی اور افسوس کرتی ہوں کہ اتنی بھی کیوں پائی۔ میرے نزدیک ایک تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ لڑکی کی عقل میں کوئی فرق نہیں۔

وہ طالب علم میری توقعات کے خلاف بہت ہی خشک مزاج اور بے پروا ثابت ہوا میں نے دو تین دفعہ اپنے چہرہ کو اس کے سامنے بے نقاب کیا۔ لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں کی۔ میں سمجھتی تھی کہ یہ مجھے دیکھ کر ایک آہ بھرے گا اور جہاں کا وہاں سکتہ کے عالم میں کھڑا رہ جائے گا یا ایک آدھ شعر گنگنائے گا۔ ایسی نظروں سے دیکھے گا جو اس کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوں مگر میں نے کبھی اسے نہ دیکھا، نہ اس لئے کہ میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی

بلکہ اندیشہ یہ تھا کہ اگر آنکھیں چار ہوئیں تو لامحالہ مجھے اپنا چہرہ اندر کر لینا پڑے گا
اور میں چاہتی تھی نمائش حسن - اس پر بھی یہاں تو کچھ بھی نہ تھا - نہ آہ تھی اور نہ واہ
مجھے بڑا رنج ہوا - کیا یہ مجھے حسین نہیں سمجھتا یا اس کا معیار حسن بہت بلند ہے --- میں
سوچتی رہی - مجھے اپنی شکست کا احساس ہونے لگا - میں نے دوسرے دن اس کے
ناشتہ میں کنکر ہی بھر دئے - گویا سزا دے دی اور پوچھا کہ "ہماری طرف گھور گھور کر
کیوں نہیں دیکھا" میں سمجھتی تھی کہ وہ کچھ شکایت کرے گا لیکن ماما حسب معمول برتن
خالی لائی - نہ معلوم اس نے کھایا یا پھینک دیا - مجھے اپنی اس حرکت پر بہت افسوس ہوا
اور اس کا بدلہ یوں کیا کہ دوپہر میں ایک میٹھے کی طشتری بھی بھیج دی -
میرا تو اب معمول ہو گیا تھا روز اس طالب علم کو مدرسہ جاتے دیکھا
کرتی - اور جب کبھی نہ دیکھتی تو تمام دن بے کل رہتی ...... کبھی کھانا نہ کھاتا تو
طبیعت بے چین ہو جاتی پوچھنا چاہتی کہ "کیوں نہیں کھایا" لیکن پوچھتی تو کس سے
ماما سے پوچھنا ہی بے کار تھا - اب رہیں اماں تو اُن سے کیسے پوچھتی - دل میں پیچ و تاب
کھا کے رہ جاتی اور دوسری دفعہ پہلے سے زیادہ کھانا بھجواتی - ایک مرتبہ میں نے
اماں سے اجازت لے کر اس کے کمرہ کی تلاشی لی - چاروں طرف کتابیں بکھری پڑی تھیں
منتشر کاغذات پر ایک ہی چیز کو کئی کئی مرتبہ لکھا گیا تھا - میز پر ایک قندیل رکھی ہوئی
تھی جو زبانِ حال سے اپنی سوختہ سامانی کی فریاد کر رہی تھی - میں نے میز پر سے ایک
کتاب اٹھائی تو نظروں کے سامنے یہ شعر تھا ؎

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے — تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمھیں بھلا سکے

میں نے اِسی شعر کو کئی مرتبہ پڑھا - جی چاہتا تھا کہ بس پڑھے جاؤں

مدرسہ چھوٹنے کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے جلدی سے ایک کاغذ پر اس شعر کو لکھا اور اپنے طرف سے یہ عبارت لکھ دی" اس کا کیا مطلب ہے؟ .... جواب لکھ کر اسی جگہ رکھ دو" اور دھڑکتے ہوئے دل سے گھر میں داخل ہوی۔ اماں نے کوئی توجہ نہ کی۔ اور میں ملنے والے جواب کی مسرتوں کے خیال میں گم ہونے لگی۔

ان کے مدرسہ جاتے ہی میں دوڑی دوڑی کمرہ میں گئی ...... جواب کے بجائے صرف اتنا لکھا ہوا پایا "مجھے معلوم نہیں" اب میں کیا کرتی۔ اسے سب کچھ معلوم تھا۔ لیکن اس نے چھپایا۔ محبت کے راز کو تو عورتیں چھپانا چاہتی ہیں۔ اس نے کیوں چھپایا۔ میں اس کی شرافت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکی مجھے اپنی بے حیائی پر بہت غصہ آیا۔ ڈوب مرنے کو جی چاہنے لگا۔ لیکن رہ رہ کے یہی خیال ستانے لگا کہ کسی طرح اپنی محبت اس پر ظاہر کی جائے میرا سر چکرانے لگا۔ میں وہاں زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکی ایک شکستہ دل کو پہلو میں لئے ہوے لوٹی اور پلنگ پر بے حس گر پڑی اس کے بعد کسی پیش قدمی کی مجھ میں ہمت نہ ہوی۔ میں بیمار سی رہنے لگی اور رفتہ رفتہ پوری بیمار ہوگئی اس بیماری میں ایک بات وجہ سکون تھی وہ یہ کہ ماما کے ذریعے وہ میری طبیعت کے بارے میں پوچھ لیا کرتا۔ میں محبت کے اتھاہ سمندر میں ڈوب رہی تھی۔ میرے لئے اس تنکے کا سہارا ہی غنیمت تھا۔

دن گزرتے دیر نہیں لگتی۔ عورت ہوں ...... ضبط سے کام لی آگ کو راکھ کے اندر ہی سلگنے دیا اور منتظر رہی کہ کوئی جھونکا اس طرف سے آئے اور یہ پھر نئے سرے سے بھڑک اٹھے

ایک دن ماما نے اماں سے کہا" میاں کہتے ہیں کہ امتحان قریب آگیا ہے آپ کی دعا کی ضرورت ہے" اماں نے کہا" خدا ضرور کامیاب کرے گا" میں نے اس بات کو سنا

اور کیا بتاؤں کہ کتنا گڑ گڑا کر اور رو رو کر میں اس کی کامیابی کے لئے دعا مانگا کرتی۔

دعا تو اُس نے اماں کی چاہی تھی یا یہ کہ اماں سے زیادہ میں ہی مانگ رہی تھی۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ساری دنیا سو رہی تھی چاروں طرف موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لیکن دیوان خانے سے برابر پڑھنے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے اماں سے مخاطب ہو کر کہا "بہت محنت کرتا ہے یہ لڑکا...... امتحان میں اول آئے گا"

"ہاں ہاں، بیٹی علم چیز ہی ایسی ہے۔ لوہے کے چنے ہیں لوہے کے" اماں نے کہا اور کروٹ بدل کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ میں نے بھی تھوڑی دیر بعد اپنے آپ کو نیند کے حوالے کر دیا اور صبح کو آنکھ اس وقت کھلی جب اماں نے شانے جھنجوڑ کر جگایا۔ اور پوچھا کہ میں نیند میں کیوں رو رہی تھی؟ میں کیوں رو رہی تھی؟ کیا میں رو رہی تھی؟ میں نے سنبھل کر کہا "بہت برا خواب دیکھا ہے۔" "کیا دیکھا ہے" انھوں نے نہایت توجہ سے جواب سننے کی آمادگی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ میں کیا کہتی کہہ دیا "آپ کے دشمنوں کا انتقال ہوگیا تھا.....،" "یہ تو برا خواب نہیں چل اٹھ، منہ دھو... میں بہت دن زندہ رہونگی چل چل" میں اٹھ بیٹھی۔ دماغ پر زور ڈالا۔ رات کے خواب کے دھندلے دھندلے نقوش ابھر آئے۔ میں نے خواب دیکھا تھا، وہ طالب علم امتحان میں ناکام ہو کر ہمیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ میں نے خواب کو خواب ہی کی حد تک رہنے دیا اور تمام دن حسب معمول کام کاج میں منہمک رہی۔ امتحانات ختم ہو چکے تھے۔ معلوم ہوا کہ پرچے اچھے گزرے جس سے سب کو خوشی اور اطمینان ہوا اور سب سے سوا مجھے کیونکہ اب یقین ہو گیا کہ "یہ پاس ہو جائے گا اور چھوڑے گا بھی نہیں۔" انھیں دنوں

بھائی صاحب کا خط آیا کہ " ان تعطیلات میں ضرور میرے ہاں آنا" اماں بھی بہت دن سے نہیں گئی تھیں۔ اب تو کہنے لگی تھیں کہ "مجھے گاؤں پسند ہے" دوسرے تعطیلات بھی ہو گئے تھے اس طالب علم کو بھی جانا ہی پڑے گا۔ میں نے بھی اپنی مرضی ظاہر کر دی۔

ہم نے اور اس طالب علم نے سامان درست کیا اور جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی تھی۔ اماں مصروف تھیں میں نے سوچا کچھ ہو اب آخری مرتبہ ہی سمجھ کر اس سے مل تو آؤں۔ میں نے شرم و حیا کو بالکل بالائے طاق رکھ دیا اور اندر کمرہ میں گھس گئی۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی ـــــ وہ حضرت ہم سے پہلے ہی سدھار چکے تھے۔ کونے میں ایک لپٹا ہوا کاغذ پڑا تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ شاید وہ مجھ سے ہی مخاطب تھا۔

محترمہ!

آپ کی نوازشوں کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔ مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس امتحان کی ناکامی کی ذمہ دار بھی آپ ہیں۔ میں آپ کے گھر میں بحیثیت طالب علم ٹھیرا ہوا تھا۔ میرے پاس دل بہلاؤ اور فضولیات کے لئے وقت نہیں تھا۔ معافی چاہتا ہوں۔

میں نے اس کاغذ کے پرزے پرزے کر دئے۔ اور غصہ میں بھری ہوئی اماں سے جا کر کہہ دی کہ "وہ لونڈا چلا گیا۔ اماں نے مجھے نیچے اوپر دیکھ کر پوچھا "تجھے کیسے معلوم"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "میں جھانک آئی ہوں"۔ اس کے بعد اماں نے نصیحتوں کا دفتر کھولا کہ اس طرح نہیں جھانکا کرتے۔ اور اگر جھانکنا ہو بھی تو کسی کو اپنے ساتھ رکھیں وغیرہ وغیرہ۔ بھائی جان کے پاس آنے کے تیسرے مہینے میں میری شادی ہوگئی رہ رہ کر اس طالب علم کی یاد آئی۔ اور میں خوب روئی

میں بہت دنوں تک غور کرتی رہی۔ وہ ناکام کیوں ہوا؟ اس نے دلجمعی سے تیاری نہیں کی ہوگی۔ کیوں؟ اس لئے کہ میرا خیال اسے ستاتا ہوگا؟۔ پھر اپنے آپ سمجھا لیتی کہ تھا بھی وہ ایسا ہی۔ مورکھ۔ اچھا ہوا جو میں نے اس کی کچھ زیادہ حوصلہ افزائی نہ کی۔ ارے اس کا اعتبار ہی کیا جو کسی دوسرے کا طالب ہو۔ مگر جب اپنے خاوند سے اس کا مقابلہ کرتی ہوں تو فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ خود ہی مزے لے لے کر اپنے کرتوت بیان کرتے ہیں۔ فلاں سے دھول دھپا لڑلیا۔ فلاں کی گالیاں سنیں۔ فلاں کو چھیڑا۔ اور جب پڑھنے لکھنے کے بارے میں پوچھتی تو کہتے "کند ذہن پڑھتے ہیں۔ امتحان سے پہلے ایک سرسری نظر ڈال لی اور کامیاب۔" "اچھا سچ کہنا"۔ میں نے ان سے ہنس کر پوچھا۔ "کبھی ناکام بھی ہوئے آپ" انھوں نے اکڑ کر کہا "ہاں ایک دفعہ"، "وہ کب" میں نے سوچتے ہوئے پوچھا کہنے لگے۔ "محبت ہوگئی تھی ایک لڑکی سے۔ اور اسی دھندے میں امتحان چوپٹ ہوگیا" اس کے بعد آہستہ آہستہ میری طرف سے منہ پھیرے ہوئے کہنے لگے۔ محترمہ آپ کی نوازشوں کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔ مگر یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ اس ناکامی کی ذمہ داری

آپ ہیں"۔ میں نے انھیں جھنجوڑ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ میں نے زچ ہو کر کہا "تم کون ہو؟"۔ کہنے لگے "ہم تمھاری پڑوسن کے گاؤں کے رہنے والے ہیں"۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ "تم نے ایسا کیوں کیا؟" میں نے ذرا تلخ لہجہ میں پوچھا "تا کہ تمھاری محبت حاصل کر سکوں"۔ انھوں نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا "تو کیا اب تمھیں وہ حاصل نہیں ہے" میں نے برا مانتے ہوئے کہا۔ جس پر انھوں نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "مرا حصہ اب دو گنا ہے ایک اس طالب علم کا اور ایک تمھارے خاوند کا"۔ میں شرما کر چپ ہو رہی۔ اس دن میری خوشی کی انتہا نہ تھی جی چاہتا تھا کہ ان پر سے صدقہ ہو جاؤں۔ یہ طالب علم بھی عجیب چیز ہوتے ہیں دیکھئے تو سہی کیسے مسکین بنے رہتے تھے۔ جانتے تھے کہ ہونے والی سسرال میں کچھ گڑبڑ ہوی اور گئے گزرے دونوں جہاں سے۔ نہ محبت ہی ملے گی نہ بیوی۔

غلط فہمی

شادی نام ہے چند عجیب اور پر لطف وارداتوں کا ۔ میرے دوست جن کی شادی میں میں مدعو تھا ممکن ہے میرے موافق نہ ہوں کیونکہ رخصتی کو بعد ختم تعلیم قرار دیا گیا تھا ۔ اور اس وقت صرف نکاح کی تقریب مسعود عمل میں لائی گئی تھی تاکہ وہ شوق سے پڑھیں اور بہت جلد فارغ التحصیل ہوجائیں ۔ میں تھکا ماندہ آیا تھا ۔ ستانے کے خیال سے آرام کرسی پر جو عین دریچہ کے سامنے رکھی ہوی تھی دراز ہوگیا خیالات کی رو میں میں کہاں سے کہاں پہونچ گیا ۔ دیکھتا کیا ہوں کہ دولھا بنا بیٹھا ہوں ایک حسین اور شرمیلی دلہن کے روبرو ہوں ۔ باتیں ہورہی ہیں اِدھر سے اصرار اُدھر سے انکار ہورہا ہے اپنی محبت کے اظہار کی ناکام کوشش کررہا ہوں کہ اتنے میں دریچہ کھلنے کی آواز نے سارے طلسم کو توڑ دیا ۔ میں نے مڑکر دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی اور چپ سادھے بیٹھا رہا ۔ ایک زنانی آواز نے مجھے مخاطب کیا " اجی اِدھر دیکھو تو " میں بہت سٹ پٹایا ۔ یہ کون تھی ؟ کیا مجھے پہچانتی ہے ۔ میری پہچانت کی تو یہاں کوئی بھی نہیں ۔ پھر یہ کون ہے ؟ جو مجھے اس طرح کے تخاطب سے سرفراز کررہی ہے میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پھر دوبارہ اسی سوال کو دہرایا گیا " سنتے ہو کہ نہیں " میں کیا کرتا سخت پریشان تھا ۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی اجنبی عورت کے اقدام تخاطب کا نشانہ بنا ہوا تھا ۔ میں نے خاموشی ہی بہتر جانی اور اِن

سوالات کا کوئی جواب نہ دیا پھر کچھ غصہ کے انداز میں کہا گیا " سن تو لو میں چلی
بھلا بار بار کہلا بھیج کر مجھے بلوانا کس مطلب کے لئے ہے اور پھر اب جو میں آگئی ہوں تو
کچھ بولتے نہیں۔ توبہ ہے باز آئی میں ایسے مردوے سے " خوش قسمتی ملاحظہ ہو کہ
ہم کسی کے نادانستہ شوہر بنے ہوئے ہیں اور ہم سے یہ پوچھا جا رہا ہے کہ ہم کیا کہنا
چاہتے ہیں ؟ فوراً ان شوہر صاحب کی بدنصیبی کا خیال آیا جو بڑی مشکلوں سے اپنی بیوی
کو کھڑکی تک کھینچ لانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ کیونکہ کسی شادی میں اپنی بیوی سے
ملاقات ہونی اتنی ہی دشوار ہے جتنی کہ خود اپنی شادی سے پہلے۔ کھڑکی کے بند ہونے
کی آواز آئی اور میں اِس مغالطہ کو زیادہ بڑھنے نہ دینے کی خاطر اٹھنے ہی کو تھا کہ
وہی آواز اپنی پوری ملائمت اور ترنم لئے ہوئے سنائی دی۔ میرے دل میں اس وقت
یہ خواہش کتنے زوروں پر تھی کہ کاش میں ہی اس کا شوہر ہوتا اور اس کے اس
محبت بھرے سوال کا جواب دے سکتا۔ کہہ رہی تھیں " آج رات کو یہیں ملوں گی "
میں نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ میں کیا جواب دے سکتا تھا؟ کئی مرتبہ سوچا کہ
صاف کہہ دوں کہ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہی ہو مگر ہمت نہ بڑھتی تھی۔ اور وہ
نیک بخت بھی معلوم ہوتا تھا بہت دن سے شوہر سے نہیں ملی تھی۔ کیونکہ میری اس
بے اعتنائی کے باوجود ٹلنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ بس کہے جاتی تھی۔ میں نے حتی الامکان
اپنے آپ کو ان الفاظ کے سننے سے باز رکھنے کی کوشش کی بھلا میں ان الفاظ کا کیسے
حقدار ہو سکتا تھا جب کہ وہ کسی اور کی شان میں تھے لیکن وہ تو اپنے نزدیک شوہر ہی سے

مخاطب تھی۔ "کتنی دفعہ کہا کہ ایک اچھی ساڑی کہیں آنے جانے کے لئے لا دو مگر کہاں اپنے ہی بناؤ سنگھار سے فرصت نہیں۔ خیر اس میں میرا کیا بگڑنے کا ہے۔ لوگ نام رکھیں گے تو تم کو ہی۔ اگر اندر آ سکتے تو دیکھتے کہ دوسروں کی بیویاں کیسی سج دھج کر آئی ہیں سونے میں پیلی ہوی جا رہی ہیں ارے ایک معمولی چپراسی کی بیوی کو بھی دیکھو تو آنکھ نہ ٹھیرے یا ایک ہم بھی ہیں کہ نہ زیور ہی ہے اور نہ کپڑے۔ باز آئی میں دعوتوں سے میں نے کتنا کہا کہ میں نہ جاؤں گی لیکن نہ مانے اچھی بے عزتی کی اب گھر تو چلو۔ ناک میں دم نہ کروں تو میرا نام (ظاہر کرنا مناسب نہیں) نہیں" اس خطبہ پر بھی ہم نے کوئی اعتراض یا عذر نہیں پیش کیا اور نہ کچھ حرکت کی جس پر وہ اور بھی برانگیختہ ہوئیں "نہ دیکھو۔ سب سمجھتی ہوں" اب اگر کہتی واہ کتنا آرام سے رکھا ہے۔ میں صدقے گئی میرے پیارے تو فوراً اٹھتے اور کچھ بیہودگیاں کرتے۔ میں کہتی ہوں تمھیں اس سینما نے خراب کیا تم چاہتے ہو کہ جیسا تم کرتے ہو ویسا ہی میں کروں۔ تم وہی حرکتیں کرتے ہو جو سینما میں دیکھتے ہو۔ میں ان نخروں اور بازاری عورتوں کی چالوں سے بہت دور بھاگتی ہوں دیکھو اب گھر چل کر اماں سے سب باتیں نہ کہوں تو کہنا۔ آخر کوئی حد ہے" مجھے ہنسی آ رہی تھی۔ لیکن کچھ گھبراہٹ بھی ہوی کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا کہ اتنے میں کسی کے قدموں کی آواز آئی اور دریچہ بند ہو گیا ایک صاحب تشریف لائے اور مجھے کرسی پر آرام کرتے دیکھ کر بھوئیں چڑھائیں اور ذرا رخ بدلتے ہوے زیر لب کہا "عجیب بدانتظامی ہے......"

میں نے یہاں سے ٹل جانا ہی مناسب سمجھا اور معافی چاہتے ہوئے اٹھ گیا ۔
میں وہاں سے اٹھا اور ایسی جگہ بیٹھا جہاں سے کھڑکی صاف طور سے نظر آتی تھی
مجھے زیادہ دیر توقف نہ کرنا پڑا وہی آواز جو کچھ دیر پہلے میری سامعہ نوازی کر رہی تھی
سنائی دی " تو پھر اب میں جاؤں " میں دیکھ رہا تھا کہ اس آواز کو سن کر وہ صاحب
ایک جست کے ساتھ دریچے کے قریب پہونچ گئے اور پُر جوش آواز میں کہا " ابھی تو
آئی ہو اور ابھی سے چلیں " " جی ہاں ابھی آئی ہوں ۔ بس بس میں اس مذاق سے
تنگ آ گئی ۔ کیا یہ بھی کسی کھیل میں دیکھا ہے کہ بیوی گھنٹہ بھر کھڑے بک بک کرے
اور خاموش رہو اور جب جانے لگے تو کہو " ابھی تو آئی ہو " وہ اتنا کہہ کر اندر چلی گئیں
اور یہ صاحب کسی فکر میں کھو گئے ۔ دوبارہ جب ان سے ملاقات ہوئی تو ان کی آنکھوں
میں غصہ صاف طور پر چھلک رہا تھا ۔ اس میں میرا بھی قصور نہیں میں کیا کرتا سننے پر
مجبور تھا ۔ آپ بھی اسے راز ہی رکھئے اور میں بھی بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں

دیر

دن بھر میں کام کرتی رہی۔ آج دیوالی ہے۔ پوجا ہوگی۔ سہیلیاں ملنے آئیں گی۔ اور ان کے دوست بھی تو آئیں گے ان مفت خوروں کے خیال ہی سے میرا ہاتھ رک جاتا ہے۔ بھلا ان کے لئے میں کیوں کمرہ کو سجاؤں۔ یہ جب کبھی آتے ہیں ان کو ستاتے ہیں۔ فرمائشیں کرتے ہیں، کھاتے ہیں۔ اور کبھی یہ توفیق نہ ہوئی کہ اپنی بھابی کو بھی کچھ بھیجتے...... ایک دفعہ بھی نہیں" ساس نے پکارا" ذرا جلدی کرو بیٹیا اور میں پھر سے اپنے کمرہ کی دیواروں پر چونا پھیرنے پر مصروف ہوگئی "بدمعاش آوارہ کہیں کے" چار بجے کے قریب کہیں فرصت ہوتی۔ کمر بھی سیدھی نہ کرنے پائی تھی کہ انھوں نے ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور شانوں کو اس زور سے بھینچا کہ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ ہنس رہے تھے۔ ایک ربر کی گڑیا کو دبانے سے بھی چیخ نکلتی ہے مگر کھیلنے والا اس چیخ سے خوش ہوا کرتا ہے مجھے آئینہ دیا..... اور خود کنگھی کرنے لگے۔ سنور رہے تھے۔ مجھے خود اب سنگار سے نفرت تھی۔ شادی سے پہلے اور کچھ دنوں بعد تک آئینہ میرے سامنے سے ہٹتا نہ تھا۔ اور ان کا بھی اس طرح کا بننا سنورنا بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ وہ جب کبھی، بال سنوارے۔ سفید دھوتی باندھے..... ایک دم سے میرے سامنے آجاتے تو آنکھوں میں بجلی سی کوند جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے دل سے خون کے قطرے ٹپک ٹپک کر گدگدی پیدا کر رہے ہیں۔ مگر اب شادی کو بہت دن ہو چکے

وہ پہلی سی بات نہ رہی۔ آگ سلگ رہی تھی لیکن شعلے باقی نہ تھے "اب کیسا معلوم ہو رہا ہوں" انھوں نے بال درست کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ میں ان کو جواب دینے میں بالکل نہ شرمائی "بہت ہی اچھے" انھوں نے میرے رخسار پر اپنی انگلی سے ضرب لگائی اور ہنستے ہوئے باہر چلے گئے .... معلوم نہیں کہاں؟ کاش میرے پاس ایک ایسا آئینہ ہوتا جس میں ان کی تمام حرکات وسکنات دیکھ سکتی۔ اور پھر انھیں قائل کرسکتی کہ تم دکان نہیں گئے تھے۔ سینما گئے۔ فلاں دوست کے پاس بیٹھے تھے۔ اور وہ سارا مال ختم ہو جانے کا بہانہ کرنا صرف اس لئے تھا کہ کسی کے پاس سے دعوت آئی تھی کاش کہ ایسا آئینہ کہیں مل جاتا۔ یا اُن کی جھوٹ بولنے کی عادت ہی چھوٹ جاتی۔

میں نے اپنی شادی کا جوڑا نکالا۔ اس جوڑے کو میں نے کس خوف اور دہشت سے پہنا تھا۔ میں پسینہ میں شرابور ہوگئی تھی۔ یہ وزنی چمکدار لباس۔ مجھے یہ لباس بہت زیب دیتا ہے۔ آسمانی رنگ کے کپڑے پر روپہلی چاند تاروں کا کام نگاہوں کو خیرہ کئے دیتا تھا۔ مجھے ان کا کہنا خوب یاد ہے "تم تو پری معلوم ہو رہی ہو۔ پری" میں پری معلوم ہوتی ہوں مجھے شبہہ ہونے لگتا .... پری۔ میں، بالوں میں تیل ڈالا کنگھی کی۔ قشقہ لگایا۔ آئینہ میں خوب گھور گھور کر دیکھا۔ اور ساس کا ہاتھ بٹانے کے لئے باورچی خانے میں چلی گئی۔

شام کے وقت میں اپنی سہیلیوں سے ملنے نکلی..... غرور سے زمین پر پیر نہیں ٹک رہے تھے

میرے ہاتھ میں رکھا ہوا پیتل کا تھال ہچکولے کھا رہا تھا۔ خوشبو میں بسی ہوئی تھی
میں خود خوشبو تھی..... ہر طرف خوشبو تھی۔ بڑی دلگی رہی ..... ایک نے بڑھ کر
میرے پاؤں چھوئے، دوسری نے میرے ہاتھوں کو اپنے سر پر رکھا۔ تیسری نے کہا
"دیوی جی۔ پرنام" میں اب سمجھی کہ یہ مجھے چھیڑ رہی ہیں۔ دیوی سمجھ رہی ہیں —
واپسی میں مجھے بہت دیر تک یہی خیال ستاتا رہا..... دیوی..... میں..... کس طرح ؟
کیا اتنی سندر ؟ تھال میرے ہاتھ سے گر پڑا..... میں نے اسے ایک ٹھوکر لگائی اور
سیدھے اپنے پلنگ پر گر پڑی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دیکھا کہ میرا گھر
آفتاب سے زیادہ روشن ہے..... لوگ جمع ہیں۔ کیوں ؟ مجھے پوجنے کے لئے.....
میں نے آنکھیں کھول دیں..... شام کی دھندلی دھندلی روشنی کھڑکی میں سے
داخل ہو رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر تمام چراغ روشن کئے۔ سارا گھر جگ اٹھا مگر میرے
دل میں ایک سیاہ دھبہ آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ میں کیا تھی ؟ اور کہاں تھی ؟
سات بج رہے تھے۔ مگر ان کا اب تک پتہ نہ تھا۔ میں اکیلی تھی شادی شدہ
ہونے کے باوجود اکیلی..... بالکل اکیلی..... وہ کہاں ہوں گے، میں سوچتی رہی۔
وہ ضرور گھومنے گئے ہوں گے۔ مجھے چھوڑ کر کیوں گئے ؟ کیا مجھے ساتھ رکھتے تو لوگ ان پر
انگلیاں اٹھاتے۔ مجھے ان عورتوں پر غصہ آ رہا تھا۔ جو بن سنور کر بازاروں میں پھرتی ہیں
کیا معلوم وہ بھی انھیں کو دیکھ رہے ہوں ؟ کسی نے کوئی اشارہ کر دیا تو.........
میں نے اپنے دماغ میں ایک زبردست جھٹکا محسوس کیا..... "کسی نے کوئی اشارہ کر دیا تو"

باہر دروازہ پر کچھ آہٹ ہوی۔ میں نے سمجھا کہ وہ...... "کیا رمیش بابو ہیں"
"یہ کون ہیں؟" میں نے دل میں کہا۔ "یہ وہ دوست ہیں۔ بڑے حسن پرست ہیں۔ ایک دفعہ
کہہ رہے تھے "حسن کو ایک کے لئے مقید کرنا پاپ ہے" واہ۔ گویا سب کو آنکھیں سینکنے کا
موقع دینا چاہئے..... میں انھیں ان کی آواز سے پہچان گئی۔ "رمیش بابو نہیں ہیں"
میں نے بڑبڑانا شروع کیا وہ گھر میں نہیں رہتے۔ انھیں اب گھر میں کوئی لطف نہیں آتا
وہ سیر کرنے گئے ہیں...... دروازہ پر پہونچ کر میں نے لسورتے ہوے کہا" رمیش بابو نہیں ہے"
"تو پھر کہاں گئے ہیں" انھوں نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوے کہا" مجھ سے پوچھ کر
تو نہیں جاتے" وہ شاید سوچنے لگے "کہاں گئے ہوں گے؟ کب تک آئیں گے۔؟"
میں نے جی کڑا کر کہا "آئیے.... بیٹھئے وہ آہی رہے ہوں گے" "کیا ماتا جی نہیں ہیں"
انھوں نے چہرے کا رخ پھیرتے ہوے پوچھا۔ میں شرما گئی اس سوال سے ان کا کیا
مطلب ہوسکتا تھا.....؟ وہ میرے متعلق کیا سوچ رہے تھے...... میں دم بخود کھڑی
رہی۔ ان کا یہ پوچھنا "کیا ماتا جی نہیں ہیں" میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اگر واقعیٔ
ماتا جی نہ ہوں تو وہ کیا سمجھیں گے؟ میں جانتی تھی کہ ماتا جی بازو کے گھر میں گئی ہوی ہیں
میں کیا کرتی؟ کھسیاتی ہنسی میرے خشک ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔ وہ اندر داخل ہوگئے۔
پان کھایا...... "کیسی گزر رہی ہے" انھوں نے مسکراتے ہوے پوچھا۔ میرے دل میں ایک
طوفان برپا تھا۔ جس میں خود میں بھی بہی چلی جارہی تھی۔ مجھے ایک دم خیال آیا۔" وہ
سیر کر رہے ہیں...... عورتیں بھی سنور کر آئی ہوں گی۔ وہ دیکھ رہے ہوں گے" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

آپ کی کرپا ہے۔ مگر مجھے کل سے بخار آرہا ہے" میں نے اپنے ہاتھ کو گردن پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ " میں بھی دیکھوں" انھوں نے تھوڑی سی کشمکش کے بعد کہا... میں آگے کو جھک گئی..... ان کا ہاتھ میری گردن پر تھا اور پھر رخسار پر..... میں جیتا مین بیٹھی ہوئی تھی۔ سارے جسم میں آگ دوڑ رہی تھی..... انھوں نے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا " بہت تھوڑا سا۔ اگر کہو تو یہ بھی نہ رہے گا" ذو معنی خیز نظریں میری طرف لگی ہوئی تھیں میں ہوش میں آچکی تھی..... میں بہت بیوقوف بن چکی تھی۔ خود کو بھول چکی تھی۔ میں نے اپنی حالت درست کی۔ اور بھاگ گئی..... اپنی ساس کے پاس..... انھوں نے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ میں نے نظریں جھکالیں... ہم دونوں واپس آگئیں۔ ساس نے مکان خالی دیکھ کر کہا "ڈرتی ہے" اور میری پیٹھ کو ٹھوکا رسید کیا۔ میرے منہ سے اطمینان کا لمبا سانس نکل گیا۔ آٹھ بجے، نو بجے وہ ابھی تک نہیں آئے۔ میں کبھی لیٹتی، کبھی ٹہلتی، کبھی عالم دیوانگی میں بھاگ جانے کا خیال کرتی۔ ان کو پکارتی واپس لانے کے لئے۔ ان کی اجڑی ہوئی خوابگاہ میں، ان کی یاد میں بے چین ہوئی کے پاس دروازہ کھلا....... " ایسی پیت کی ریت کبھی دیکھی سنی ناہیں" کوئی گنگناتا آرہا تھا

کون؟..........

" ماتاجی میں ابھی آیا" انھوں نے مجھے ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے جاتے ہوئے کہا، " ماتاجی کچھ مسکرائیں اور پھر اپنے بیٹے کو دیکھ کر چپ ہو رہیں مجھے اندر لاکر انھوں نے میری گود میں مٹھائی، پھل، کھلونے سب کچھ ڈال دئے۔ اور خود میرے دل میں اپنے پاؤں گاڑے

میری آنکھوں سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سب چیزیں لے جاکر ماتا جی کے پاس رکھ دیں۔ انھوں نے پہلے تو لینے سے انکار کیا مگر بعد میں دعائیں دیتے ہوئے کہا "تیرا سہاگ قائم رہے وغیرہ" انھوں نے اپنے بستر کا رخ کیا...... میرے دل میں گھی کے چراغ سلگ رہے تھے۔ انھوں نے پکارا، شانتا...... میں نے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا " بہت جلد آگئے آج " "کچھ نہ پوچھو، بس پھنس گئے تھے" "کیا کسی کے جال میں؟" میں نے طنز سے کہا۔ " رہنے دیجئے آپ کی خیال آرائیاں سیکل کو قندیل نہیں تھی۔ سمجھیں.... اور بس اسی وجہ سے دیر ہوگئی.... پیدل آرہے ہیں" میں بہت نادم ہوی ان کے پیر چوم لینے کو جی چاہنے لگا۔ میں نے ان کے متعلق کیا کیا سوچا تھا۔ ایشور مجھے معاف کرے۔ " اب کی دفعہ تمھیں بھی ساتھ لے چلیں گے" "کیوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "قندیل کی جگہ" انھوں نے ہنستے ہوئے کہا....... "جی"........
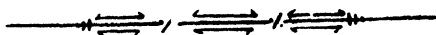
مامتا

میں ایک تنگ اور سنسان گلی سے گزر رہا تھا...... ایسی گلیوں میں پاؤں رکھتے ہوئے بھی مجھے گھن آتی ہے۔ جلد جلد ممکنہ تیزی سے اس گلی کو طے کر رہا تھا..... گلی کے ایک کونے میں ایک گٹھڑی سی نظر پڑی..... میں نے اسے نظر انداز کر دینا چاہا اور اپنے آپ کو بچاتے ہوئے اس سے آگے بڑھ چکا تھا..... ایک نحیف آواز نے میرے پاؤں پکڑ لئے کوئی مجھے "بابا" کہہ کر پکار رہا تھا..... اس آواز میں تھرتھراہٹ تھی..... درد تھا..... کشش تھی..... میں بے اختیار رک گیا میں نے مڑ کر دیکھا..... اس گٹھڑی میں حرکت پیدا ہوئی اور ایک انسانی ہاتھ میرے آگے اپنی کم مایگی کی فریاد کر رہا تھا۔ میں نے اس ہاتھ کو غور سے دیکھا..... اس میں انگلیاں بھی تھیں ہتھیلی بھی تھی..... لکیریں بھی تھیں..... جن کو دیکھ کر لوگ قسمت کا حال بتاتے ہیں لیکن میں ان لکیروں کو دیکھ رہا تھا جو سارے ہاتھ پر پھیلی ہوئی تھیں..... میرے دل میں ایک درد سا اٹھا اور میں اپنے گراں قدر جذبات ہمدردی کے اظہار کے لئے بہانہ ڈھونڈھنے لگا۔ میری نظریں اٹھیں..... ڈوبے نور آنکھیں جن میں سے گندے رنگ کا پانی شکنوں کی راہ بہہ کر اس کے میلے کچیلے کپڑوں میں جذب ہو رہا تھا۔ ایک دبی اور سوکھی ہوئی ناک..... ...... اندر کو دھنسا ہوا منہ..... بلاشبہ وہ ایک انسانی ڈھانچہ تھا۔ میں نے اپنے جیب ٹٹولے۔ وہ اس کے خالی ہاتھ سے زیادہ

سرمایہ دار نہ تھے۔ میں نے اپنے آپ پر نفرین بھیجی۔ آج میں نے ہوٹل میں کتنے پیسے خرچ کئے تھے...... اف کتنی خطرناک فضول خرچی..... مالک ہوٹل کے ظاہری اخلاق اور اصرار پر میں نے کیا کیا نہ خریدا؟ میں نے عہد کرلیا کہ اب کبھی کسی ہوٹل میں نہ جاؤں گا...... میں دوسرے راہ گیروں سے زیادہ رحم دل اور سخی ثابت نہ ہوا..... میں نے اپنے گھر کی راہ لی۔ دور تک میرے کانوں میں "بابا" "بابا" کی آواز آتی رہی اور ہر دفعہ میرے دل پر نشتر کا کام کرتی گئی..... کتنی شرم کی بات تھی کہ دل میں تو رحم وکرم کے دریا موجزن ہوں اور جیب میں کوڑی بھی نہ ہو میں نے بعد میں غور کیا "کیا جیب کی گرمی کے ساتھ یہ جذبات بھی جوشزن ہوسکیں گے"

میرا گھر کچھ زیادہ دور نہ تھا..... میں نے کبھی اس بات پر غور نہ کیا کہ اتنا بڑا مکان میرے لئے ناکافی ہو اور وہ بڑھیا زمین کے ایک چھوٹے سے حصے پر اپنے رات اور دن گزارے۔ رات میں مجھے کچھ دیر نیند نہ آئی..... تھوڑے تھوڑے وقفہ سے وہی ٹھٹھرا اور کملایا ہوا ہاتھ میری نظروں میں پھرنے لگتا۔ لیکن ایک کروٹ نے مجھے اپنے نرم وگرم بستر کا احساس کرایا اور میں نے اپنے آپ کو دنیا سے بے خبر نیند کی آغوش میں پایا۔ صبح کو میری حالت متغیر تھی...... میں نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا یہ کہ میں بھی اس بوڑھیا کی طرح ایک سڑک کے کنارے کھڑا ہر آنے جانے والے کے سامنے دستِ سوال دراز کر رہا ہوں..... میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے...... اگر حقیقت ہو تو..... میں کیا کروں گا۔ "وہ بڑھیا بھی شاید خواب دیکھ رہی ہے" میں نے دل میں کہا

دوسری دفعہ میں پھر اسی گلی سے گزرا..... آج بھی وہ ہاتھ اٹھا "بابا" کے لفظ کے ساتھ ہی میرا ہاتھ اس کی طرف بڑھا..... اس کی خشک ہتھیلی پر ایک تانبے کا سکہ رکھ دیا گیا..... میں آگے بڑھ گیا میرے دل میں سکون تھا.... اطمینان تھا میں نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا..... آج میرے نزدیک حاتم کی بھی کوئی حقیقت نہ تھی میرے دل میں سمندر کی سی وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے تعجب ہونے لگا کہ یہ امیر لوگ دولت کو کیسے جمع رکھتے ہیں جب کہ ان کے چاروں طرف ملتجی نگاہیں اور پھیلے ہوئے ہاتھ ان کے رحم و کرم کی بھیک مانگ رہے ہوں..... میرے پاس افسوس کچھ نہ تھا..... "کل بھی..... اس بڑھیا کو دیں گے کچھ" میں نے مصمم ارادہ کر لیا

اب کی دفعہ میں نے کچھ زیادہ ہی پیسے رکھے اور دیر تک اس بوڑھی بھکارن کے لکڑی سے سخت ہاتھ کو اپنی پُر گوشت اور ملائم انگلیوں سے چھوتا رہا۔ اس نے ایک ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح جسے اب دوبارہ ابھرنا نہ ہو "بابا" کہا اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے منہ سے "بابا" مجھے خوش آیند معلوم ہوتا..... گھر کے مہذب بڑے بڑے اور فصیح ناموں میں بھی یہ شیرینی نہ تھی..... بابا۔

میری اس سخاوت کی وجہ سے میری بعض ضرورتیں پوری نہ ہوتی تھیں۔ لیکن مجھے کوئی رنج نہ تھا..... مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں ان کو نظر انداز کر کے ایک عظیم الشان قربانی کر رہا ہوں اور سب سے بڑی ضرورت کو پورا کر رہا ہوں۔ ایک استاد بھی شاید ایسا ہی فخر محسوس کرتا ہے جب وہ کسی ہمہ تن التجا، طالب علم کو

چند نشانات یا چند حاضریوں سے سرفراز کرتا ہے...... اس کی کرسی بادلوں سے بھی بلند ہو جاتی ہو گی۔

وہ بڑھیا میرے قدموں کی آواز پہچاننے لگی تھی۔ جب کبھی میں اس طرف سے گزرتا وہ خاموش رہتی... نہ تو اس کا ہاتھ ہی ہلتا اور نہ زبان۔ میں خاموشی سے جو کچھ بھی دینا ہوتا اس کے ہاتھ میں رکھ دیتا...... اور چلا جاتا.... میرے ایک دوست نے میری اس لغو حرکت کو (جیسا کہ ان کا خیال ہے) دیکھا۔ چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پیدا کی اور کہا "بہت سخی ہو.... عاقبت سنوار رہے ہو....." اور پھر رازدارانہ لہجہ میں "اُلو نہ بنو...... دیکھنے ہو ان فقیروں میں ریاکاری اور مکر کتنا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے..... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ہر سانس دم واپسیں ہے..... مگر یہ سب بدمعاشیاں ہیں ان کی... سمجھے" "ہاں...." میں نے کہا اور ان کی طرف دیکھا تک بھی نہیں۔ انسان چاہے برا کام ہی کیوں نہ کرے وہ اسے اچھا سمجھتا ہے.... دوسروں کا اختلاف اسے اتنا ہی شاق گزرتا ہے جتنا اس کا اختلاف اُن کو۔ "چلو ہوٹل چلیں" انھوں نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے اور میری طرف سے منہ پھیرتے ہوئے کہا...... میں نے ان سے معافی چاہی اور خاموشی سے اپنے گھر کی راہ لی... سنتا ہوں انھوں نے دوسرے دوست سے میری بہت شکایت کی کہا کہ میں بہت مغرور ہوں بداخلاق ہوں..... اور ساتھ ہی بیوقوف بھی ہوں...... خیر۔

اس بڑھیا کا سن ساٹھ سے زیادہ ہی ہوگا... وہ بمشکل بات کر سکتی تھی....

اور کسی کو یہ تک نہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ کون ہے؟ اس حالت میں کیوں ہے ؟

اور ضرورت بھی نہ تھی..... چاروں طرف تنومند، طرار اور موروثی فقیر نظر آتے ہیں ان میں یہ بھکارن..... بوڑھی۔ اپاہج..... قابل رحم، بالکل ناقابلِ التفات۔ میں عبرت سے اُسے تکتا رہتا..... بڑھاپا..... کتنی ہیبت ناک چیز ہوتی ہے۔

ایک دن وہ بالکل بے سدھ ہو تھی۔ گھسٹتے گھسٹتے وہ سڑک پر آ گئی تھی۔ میں نے اس کے پھیلی ہوئی ٹانگوں کو سیدھا کیا..... راستہ چلنے والوں کی نظر میں ایک بوڑھی بھکارن کے پاؤں کیا اہمیت رکھ سکتے ہیں۔ اس کی حالت بہت خراب تھی..... اس نے اپنا سر نہ اٹھایا..... میں نے اسے ہلایا..... اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں..... گویا سب کچھ دیکھ ہی تولے گی..... اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ پر رکھا..... مجھ سے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی..... تھوڑی دیر بعد اس نے اپنی کمر سے ایک تھیلی نکالی..... اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا " میرے..... بیٹے کو یہ..... سامنے کے گھر میں....." وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی..... نیم غشی کی حالت میں وہ لاش کی طرح جھک گئی..... میرے دل میں عجیب طرح کی کشمکش ہو رہی تھی۔ "اس کا بیٹا بھی ہے کوئی ؟" کیا یہ ممکن ہے ؟ میرے لئے قطعی فیصلہ کرنا ممکن نہ تھا..... میں نے اس کے بتائے ہوئے مکان پر آواز دی..... برتن مانجھنے کی آواز کے سوا کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے اس کام کو کل پہ اٹھا رکھا اور گھر چلا آیا۔ نیند غائب تھی..... کروٹیں ہی بدلتا رہا..... سردی اس شدت کی تھی کہ گرم لحاف کے اندر بھی دانت بج رہے تھے اس بوڑھی بھکارن کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگی

"اس کا کیا حال ہوگا" میں نے سوچنا شروع کیا "اس کے پاس تو اوڑھنے کو بھی کچھ نہیں"۔ میری ہمدردی نے پھر جوش مارا، میں نے ایک لحاف اپنے ساتھ لے لیا اور گھر کے باہر آیا۔ دو چار قدم ہی گیا ہوں گا کہ بارش شروع ہوگئی... میں اسی تیزی سے واپس ہوا۔ اور پانی کے تھمنے کا انتظار کرنے لگا پانی بہت دیر بعد تھما۔ لیکن میں سو رہا تھا..... صبح کو اٹھا تو بہت پشیمان تھا میں نے وہ تھیلی اپنے ساتھ لے لی اور دوبارہ اسی مکان پر دستک دی.... اندر سے ایک نوجوان باہر آیا... میں نے اُسے بڑھیا کی دی ہوئی تھیلی دی.... اُس نے اُسے میرے ہی سامنے کھولا... گیارہ تانبے کے سکے، تھیلی کو وزنی بنائے ہوئے تھے.... اور شاید وہ میرے ہی دے ہوئے تھے... مجھے تعجب ہوا... ایسا محسوس ہوا کہ زمین میں دھنسا جا رہا ہوں.......

"یہ شخص اس کا بیٹا ہے.... اور وہ اس کی ماں ہے" میں نے سوچنا شروع کیا... اندر سے باتوں کی آواز آرہی تھی کوئی عورت کہہ رہی تھی "پھینک آؤ جی..... اس منحوس بڑھیا کی ہمیں کوئی چیز بھی نہیں چاہئے" یہ اس شخص کی بیوی ہے..... میرے لئے یہ جاننا مشکل نہ تھا..... وہ باہر آیا... غصہ کے آثار اس کے چہرہ سے نمایاں تھے اس نے اس بڑھیا کا رخ کیا اور میں بھی اس کے پیچھے چلا..... اس نے نزدیک جا کر اسے جھنجوڑا.... لیکن اس نے کوئی حرکت نہ کی... وہ سرد ہو چکی تھی میں آگے بڑھا۔ بڑھیا کی آنکھیں بند تھیں... مڑا دیا ہوا پیسہ اس کی ہتھیلی پر دھرا ہوا تھا... میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے... میں نے اس بے مروت کی طرف دیکھ کر کہا "یہ تمھاری ماں تھی" اس نے گلوگیر آواز میں صرف "ہاں" کہا اور اپنی بیوی کی طرف جھپٹا جو اس کی ماں کی شان میں اپنی زبان کو تیزی سے چلا رہی تھی میں زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا مجھے افسوس تھا کہ میں بڑھیا کے کسی کام نہ آسکا

عشقِ خوش انجام

چالو عشق کو اگر ایک مرض مان لیا جائے تو بیچارا رضا اس سے مہلک طور پر متاثر تھا - وہ تو کہئے کہ زندگی ہے - اور کسی کی مسیحائی کا صدقہ کہ جی رہا ہے - اور خود اس کی زبان میں - ع جیتے ہیں کہ مرجانا مشکل نظر آتا ہے - کل ملا سر راہ بھی وہی بے تکلفی برتنی چاہی جو اپنے دیوانخانے میں ہوا کرتی ہے " اے مرے ناصح مشفق" کہتے ہوے - باہیں مری گردن میں حائل کردیں - میں نے گھبرا کر کہا " یہ کیا کرتے ہو - سڑک ہے - اور میں عاشق نہیں ہوں میں ایک شریف آدمی ہوں " " اجی دیکھی ہوی ہیں سب کی شرافتیں " رضا نے کچھ برا مانتے ہوے ہی کہا - لیکن پھر گویا آمدم برسرِ مطلب کہنے لگا " ان دنوں جوش جنوں ہے ترے دیوانے کو " " تو پھر - میرے لایق کوئی خدمت " میں نے سر کو خم کرتے ہوے پوچھا - " چھوڑو بھی اس ایذا رسانی کو ارے کبھی تو دلجوئی " میں نے پوچھا - " کوی نیا معشوق پیدا ہوا ہے " کہنے لگے —— " اُسے تو پیدا ہوے کوئی اٹھارہ انیس سال ہو گئے " ایک نہایت لاجواب انگلوانڈین چیز دیکھنے میں آئی - اُسے دیکھتے ہی میرا دل زور سے پھڑ پھڑا یا - اور کچھ خالی خالی سا محسوس ہونے لگا - اس صنم خانے میں کسی بت کی کمی محسوس ہونے لگی - اور جب وہ نظروں کے سامنے سے گزر گئی تو معلوم ہوا کہ میری زندگی اس کے روپ میں تھی اور وہ چلی گئی ——

"انا للّٰہ وانا الیہ راجعون" میں نے نہایت دردآمیز لہجہ میں کہا۔" ہاں بھئی
سچ ہے ۔جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے ؛ آپ بندہ نواز کیا جانیں" "توبہ رضا
قسم لے لو جو یہ الفاظ صدقِ دل سے نہ ہوں ۔مجھے تم سے سخت ہمدردی ہے"۔" خدا
تمھیں خوش رکھے۔ اس کا نیک اجر دے ۔ٹوٹے ہوئے دلوں کی فریاد سننا۔
ان کو خوش کرنا ۔تم کیا سمجھتے ہو ؟ کچھ کم کارِ ثواب ہے"۔"میں نے کہا"مجھے اچھی طرح
علم ہے ۔اور میں یہ جانتے ہوئے ہی تمھاری ہمدردی پر مجبور ہوں"" ہاں خدا تم کو
اس کا اجر دے گا۔ ضرور"۔ اس نے مجھے ایک ہوٹل میں لے جاتے ہوئے کہا ــــ
میں نے ازراہ تکلف کہا " اجی اس کی کیا ضرورت تھی" "نہیں تم نہیں سمجھ سکتے"
رضا نے مجھے اندر گھسیٹتے ہوئے جواب دیا ۔ہم دونوں ایک پرسکون اور علیحدہ
کمرے میں بیٹھ گئے ۔ رضا نے چاء لانے کو کہا ۔ اور مجھے اپنے بازو بٹھاتے ہوئے
کہنا شروع کیا ۔" تو سنا آپ نے جنابِ من ! یہہ ہے ہماری زندگی ۔ہاں تو شاید
میں کسی کے متعلق کچھ کہہ رہا تھا"۔ "ہاں" میں نے بھی یاد کرتے ہوئے کہا ۔" کچھ
کہہ تو رہے تھے"۔ "کسی لڑکی ہی کے متعلق کہہ رہا تھا نا"۔ " شاید"۔میں نے
منہ صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔" تو وہ لڑکی اتنی حسین ، اتنی حسین ۔میں کیا
عرض کروں۔میں کیا عرض کروں ۔ الفاظ نہیں ملتے ۔اس کا دلفریب چہرہ
اس کی یونانی دیویوں کی سی ساخت ۔اس کی فتنہ انگیز چال ۔اس کے لہراتے
ہوئے سیاہ گیسو ۔ اس کی وہ دو نشیلی آنکھیں ۔اُف ، واللہ، خوبصورت، دلکش، بیشک"

"رہنے بھی دو ان تعلّیوں کو۔ تم عاشقوں کو تو ساری عورتیں پریاں معلوم ہوتی ہیں"
رضا نے۔ میری طرف فرضی غصہ سے دیکھا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ "تم بھی غضب
کرتے ہو۔ تم سے عشق کرنے میں تو لطف آئے گا۔" میں نے اپنی کرسی چھوڑ دی اور
ٹوپی کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ رضا نے اپنا سر میری گود میں رکھ دیا "معاف کرو
مرے دوست معاف۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے معاف کیا۔ میرے خدا
نے بھی معاف کیا۔ مگر اب للّٰہ اپنی داستان کو مختصر کرو۔ اور جلد اجازت دو۔"
"اچھا بھئی" رضا نے کہنا شروع کیا۔ "یہ خاکسار روز اس نازنین کی زیارت
کرنے لگا۔" "دوسری" جو ہیں نا۔ تم تو شاید جانتے ہی ہو۔" "ہاں، ہاں" میں نے
بے صبری سے کہا۔ "انھوں نے شکایت آمیز انداز سے دیکھا بلکہ سامنے سے گزرا تو
دیکھا ہی نہیں۔ مگر میں دل میں کہتا رہا۔ ع نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند۔ اور
جب کتّا کسی در کے کئی پھیرے لگاتا ہے تو مالک کو کچھ رحم آ ہی جاتا ہے۔ نا، کیوں؟"
"واقعہ ہے" میں نے پورے وثوق کے ساتھ کہا۔ "اس رشکِ لیلی نے میری طرف
ایسی نظروں سے دیکھا گویا کچھ کہنا چاہتی ہے اور نظروں کے بھید پانا تو اب میرے
بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گیا ہے" میں نے آہستہ سے کہا۔ "مبارک"۔ "نظریں
ملنے لگیں اور آخر۔ محبت سچی ہو تو پھر معشوق کیسے نہیں مل سکتا ہے۔ وہ ملی۔ مجھ سے
کہا۔ "آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں" مجھ سے وہ ایسا سوال کرے اور میں چپ رہوں
میں ہمہ تن "تجھی سے تجھے چاہتا ہوں" اس نے کچھ دیر کے لئے اپنا سر جھکا لیا۔

پھر جلدی سے ۔" آپ مہربانی فرماکر کل تشریف لائے ۔میرا گھر یہیں بازو کی گلی میں ہے ۔"
میرا دماغ اس وقت کام نہیں کر رہا تھا ۔ قدم زمیں پر نہیں ٹک رہے تھے ۔ دل میں
کہنے لگا ۔" لے رضا اب سنبھل ۔شادی مرگ نہ ہو جائے تو سہی ۔" کسی سے سیدھے
منہ بات نہ کی ۔کل کی ملاقات کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے لگا ۔چہرے پہ حزن وملال
اور حسرت ہو ۔اس کے لئے رات کا کھانا اڑا دیا ۔کچھ اشعار یاد کر لینے چاہئیں ۔ فوراً داغ
کا دیوان کھول کر اس میں سے ایک " مرصع " غزل یاد کر لی ۔اور نہایت اطمینان سے
وہی اشعار گنگناتا ۔سو گیا ۔

صبح ہوی ۔سوچنے لگا ۔اس نے کہا تھا کہ " کل تشریف لائے ۔" اور آج شام
کے چھے بجے بھی کل ہی کے شمار میں ہیں ۔اور صبح کے چھے بجے بھی ۔ بارہ ' ایک بجے
ہو آئیں گے ۔ دل میں سوچا لیکن شوق کہتا تھا " چل اور ابھی چل ۔" جانو پر لگ گئے
غیر اختیاری طور پر اس کے گھر تک پہونچ گیا ۔کوئی آٹھ یا ساڑھے آٹھ کا عمل ہوگا ۔
میں نے ڈرتے ڈرتے کنڈی کھٹکھٹائی ۔اندر سے کوئی آواز نہ آئی ۔ بڑی شرمندگی
ہو رہی تھی ۔" ابھی تو وہ شاید سو رہی ہو ۔جوانی کی نیند ۔کیا سمجھے گی ۔الّو ۔بدمعاش
مگر پھر یہ پہلو سامنے ہو تاکہ عشق کی سچائی کا یقین بھی ہو جائے گا ۔سمجھے گی کہ بہت
بے تاب ہے ۔بغیر میرے پل بھر کو چین نہیں ۔ اور اگر یہ کسی طرح اس کی سمجھ میں
آجائے تو ۔مجھے اور کیا چاہئے تھا اتنے میں کچھ کھٹکا ہوا ۔ چال ہی سے سمجھ گیا کہ وہی ہے،
اللہ غنی عشق میں قوت تخیل کتنی تیز ہو جاتی ہے ۔کیا سمجھتے ہو ۔وہاں تو وہی تھی ——

ہلکے سرخ رنگ کی ساڑی۔ اس میں نکھرا ہوا چہرہ۔ مجھے اپنی آنکھوں پر دھوکہ ہونے لگا
مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ اور پھر نہایت ملائمت سے "کم اِن (come in)"
کہا، میں اپنے دل کو ہاتھوں سے تھامتا۔ اپنی خوبیٔ قسمت پر رشک کرتا اس کے
پیچھے پیچھے چلا۔ ایک آراستہ پیراستہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے مجھے بھی اندر
آنے کا اشارہ کیا۔ میں اپنے عشق کی بے مائگی پر افسوس کرتا کہ حسن تو اس قدر عشق نواز ہے
اور عشق اس طرح خاموش اور لاپروا۔ جی میں آیا کہ قدموں پر سر رکھ دوں۔ اس نے
کرسی کی طرف اشارہ کر کے "تشریف رکھیئے" کہا۔ میں نے اس کی طرف شرمائی ہوئی
نظروں سے دیکھا اور پھر ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "شکریہ" کہتے ہوئے
اس نے وہ کرسی کھینچ لی اور میرے قریب بیٹھ گئی۔ "فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت
کر سکتی؟" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ میں بوکھلا گیا لجاجت سے کہا
آپ کی نوازش مگر......... میں آپ سے پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔" "کسی
شریف عورت کو سرِ بازار گھورتے رہنا۔ اس کے لئے آہیں کھینچنا۔ اشعار گنگناتا ـــ
کیا اسی مطلب کے لئے ہے؟" مجھ پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میں نے متوحش نظروں
سے دیکھتے ہوئے رکتے رکتے کہا۔ "میں قصوروار ہوں۔ گناہگار ہوں۔ دل کے ہاتھوں
مجبور تھا۔ یہ سب آپ کی..... آپ کی..... نظروں کی۔ شرارت؟" "جی ـــ
قدر افزائی کا شکریہ؟" اس نے جی کو کھینچتے ہوئے کہا۔ "اور اب آپ کیا چاہتے ہیں؟"
"میں آپ سے محبت کرنا چاہتا ہوں" "کیجئے شوق سے کیجئے۔ میں نے آپ کو منع نہیں کیا

مگر ذرا آپ مجھے گھورنے میں احتیاط سے کام لیں۔ محبت تو چھپ چھپ کے کی جاتی ہے آنکھوں پر مسکراہٹ۔ دل میں آنسو۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔" جی۔ جی۔ مگر میں آپ کے شعلۂ حسن کا پروانہ ہوں۔ اگر آپ کو نہ دیکھوں گا تو جیؤں گا کیونکر۔" "لیجئے یہ میری تصویر۔ اس سے دل بہلا لیجئے" اس نے دیوار سے اپنی تصویر اتارتے ہوئے کہا۔ مجھ پر اب کچھ ہمت آچکی تھی رعب حسن دور ہو رہا تھا۔ میں نے سینہ تان کر کہا۔ "میری محبت ان کھلونوں سے بہت کھیل چکی۔ میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔ میں مر جاؤں گا۔ مجھے یہ عشق کہیں کا نہ رکھے گا۔ میری۔ پی۔ یاری۔ تم میرے دل کی دھڑکنوں کو اپنے ہاتھوں پر محسوس کرو۔ تم میری بے تابیوں اور حسرتوں کا اندازہ نہیں کر سکتیں شاید۔ میں جب سے تمھاری نظروں کا گھائل ہوا ہوں۔ دن کا چین رات کی نیند۔ کھانا پینا سب حرام ہے۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ تصور تمھارا۔ تمھاری ہی باتیں۔ دم بھر کو تمھارا تصور ہٹا کہ ہول ہول سی۔ جیسے چوروں نے میرا ڈیڑھ دو لاکھ کا اثاثہ لوٹ لیا ہو۔ راتوں کو تمھارے ہی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میری آنکھوں میں میری محبت کی گہرائی دیکھو۔ دیکھو!" میں دو زانو ہو گیا۔ اپنے ہاتھ اس کے آگے پھیلا دئے۔ اس نے مجھے اٹھاتے ہوئے کہا۔" تو اس کا ثبوت کیا ہے کہ آپ بغیر میرے زندہ نہیں رہ سکتے۔" "ثبوت۔ تم ثبوت چاہتی ہو۔ تو لو۔ آج ہی کہہ دو کہ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ اے تو یہ۔ تمھاری درخواست نہیں سننا چاہتی اور کل تم مجھے مردہ پاؤ گی۔ آج جو تمھارے سامنے عرضِ مدعا کر رہا ہے۔ جو اتنا

بڑھ بڑھ کے کہہ رہا ہے ۔ اُسے مردہ پاؤ گی ۔ اس کی تمناؤں کا جنازہ نکلے گا ۔ حسرتوں، امیدوں اور ارمانوں کا خون ہوگا ۔ اس وقت تم کو یقین آئے گا ۔ ثبوت مل جائے گا ۔ سر پیٹ لو گی ۔ میری جاں! چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے ۔"
"اچھا ہمیں یہ فیصلہ منظور ہے ۔ ہم آپ کی درخواست نامنظور کرتے ہیں ۔" "آپ تشریف لے جائیں ۔" میں حسرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا ۔ "جائیے ۔" میں پھر بھی خاموش کھڑا اسے اپنی محبت کا یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا ۔ "بھائی جان" اس نے ذرا آواز کو اٹھاتے ہوئے کہا ۔ "کیا ہے ؟" اندر کے کمرے سے ایک کرخت آواز آئی ۔
میں دوسرے لمحہ اس کے گھر کے باہر تھا ۔ باہر آکر سب سے پہلے میں نے باہر سے زنجیر لگا لی ۔ اور چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا ۔ "اے وہ گدھی کی بچی ۔ حرافہ ۔ بدچلن ۔ حرامزادی تجھ میں کیا ہے ۔ نہ رنگ نہ روپ اپنی صورت دیکھ ۔ اپنا جسم دیکھ ۔ بیہودی ۔ میں تجھ پر تھوکتا ہوں ۔ تھو تھو ۔ اخ تھو ۔ تیری آنکھیں بے نور اور بے رونق ہیں ۔ اور بلا بتر کہتا ہوا اپنے گھر بھاگ آیا ۔ ہاں ۔ ہاں" اس نے جھٹکے دیتے ہوئے کہا ۔ میں نے اپنی چائے ختم کر دی تھی ۔ اُس نے اپنی ٹھنڈی چائے واپس کر دی اور ہم دونوں باہر نکل آئے میں رخصت ہونے کے لئے اس کی طرف متوجہ ہوا ۔ لیکن وہ ایک موٹر کا نمبر نوٹ کرنے میں مصروف تھا ۔ میں نے خاموشی سے اپنا راستہ لیا ۔

مشعلیں

ملازم کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ میرے علاقے کی حد اب ختم ہو چکی ہے۔ اور ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر کے ایک گاؤں کی تنقیح کے بعد مجھے واپس ہو جانا چاہئے۔ بیل گاڑی پر واپسی مجھے منظور نہ تھی۔ دکن کے شمال مغربی علاقے کی زمین پتھریلی ہونے کے علاوہ گہرے نشیبوں سے بنی ہوی ہے۔ گاڑی کا پہیہ بعض اوقات اتنی گہرائی میں اتر جاتا تھا کہ سامان مجھ پر لد جاتا۔ اور راستہ کے پتھروں کی وجہہ سے دھچکوں نے جسم کی بوٹی بوٹی کچی کر دی تھی۔ زیادہ فاصلہ میں نے پیدل ہی طے کیا تھا۔ گھنے گھنے جنگلوں سے گزرتے ہوے ہی میں بنڈی میں سوار رہتا۔ ریچھ کے جوڑے ...... فاصلے پر پہاڑوں پر چڑھتے دکھائی دیتے۔ بھیڑیوں اور لومڑیوں کے غول کے غول تاڑبن میں گھستے نظر آتے۔ مجھے اپنے شکاری نہ ہونے پر افسوس ہوتا۔ کم از کم ہرن اور خرگوش ہی کے شکار سے دل بہلا سکتا۔ پھر بھی میرے اطمینان کے لئے میرے پاس شکاری چاقو ایک دو نالی بھری ہوی بندوق موجود تھی۔ میں نے اسی سے پوچھا "ریلوے اسٹیشن کتنی دور ہے یہاں سے" اس نے پٹیل سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ بارہ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن ہے۔ میں نے ریل ہی سے واپس جانا مناسب سمجھا اور شام کے چھے بجے ملازم نے بنڈی تیار کرائی اور چاوڑی کے سامنے اس کو لا کھڑا کر دیا۔ چاندنی راتیں تھیں۔ راستہ بھی زیادہ خطرناک نہ تھا ——

آہستہ آہستہ پہونچ جانے کے خیال سے یہی وقت مناسب معلوم ہوا۔ راستہ ایک عجیب سرمستی سے کے عالم میں کٹ رہا تھا موہے کے درخت چاندنی میں تپسوی سادھوؤں کی طرح خاموش اور مقدس نظر آرہے تھے..... ہماری گاڑی ان دو رویہ درختوں میں سے ہچکولے کھاتی ۔چرچراتی چلی جارہی تھی گاڑیبان نے آہستہ آہستہ گنگنانا شروع کیا ۔میں اس کے گانے کو سمجھ نہ سکا۔تھوڑی دیر بعد اس نے زور سے راگ کھینچنے شروع کئے ۔میں نے اپنے دورہ کے ملازم سے پوچھا " یہ کیا گا رہا ہے؟" اس نے گاڑیبان کے گانے کو غور سے سنا اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر مسکراتے ہوئے کہا "گاؤں والوں کا ایک گیت ہے" میں نے پوچھا "کیا مطلب ہے اس کا....؟" اس نے اس کے گانے پر اپنے کان دھرے اور مجھ سے اس کا مطلب یوں بیان کیا۔ "وہ کہتا ہے کہ تو میرے ساتھ آتی ہے تو آ۔" "یہ تو کون ہے؟" میں نے ہنستے ہوئے ٹوکا۔ وہ چپ ہو گیا ۔ اور کچھ سوچ کر ۔میں تیرے لئے روپیہ لاؤں گا، تیرے لئے ساڑی لاؤں گا ۔ چوڑیاں لاؤں گا..... آئینہ لاؤں گا..... تو میرے ساتھ آتی ہے تو آ...... پہاڑ کے اس پار ۔ اور وہ "تو" یہ جواب دیتی ہے....." اس نے گاڑیبان کے گانے کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا اور جب اس نے اپنا گانا ختم کر لیا تو اس نے مطلب بیان کیا "کہتی ہے کہ مجھے تیرے روپیہ کی ضرورت ہے نہ ساڑی کی ضرورت ہے، نہ چوڑیوں کی ضرورت ہے...... نہ آئینہ کی ضرورت ہے۔ میں پہاڑ کے اُس پار بھی نہیں آؤں گی" مجھے بے حد لطف آیا... گاڑیبان کو دوبارہ

اُسی چیز کے گانے کو کہا ۔ اور اس کے ہر ٹکڑے پر میں سمجھ لیتا کہ اب " روپیہ لاؤں گا" اور اب "ساڑی لاؤں گا ....." کہہ رہا ہے ۔ دور سے چند چراغ جھلملاتے نظر آئے ۔ میں نے ملازم سے پوچھا " یہ چراغ کیسے ہیں ؟" "کوئی گاؤں ہوگا" اس نے اس طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا ۔ چراغ قریب ہوتے گئے ..... ان کی روشنی بڑھتی گئی ..... گاؤں اس طرح تو ایک دم قریب نہیں آسکتا ..... اور ایسی صورت میں جب کہ ہماری گاڑی اس رفتار سے چل رہی تھی ۔ ملازم نے گاڑیبان سے اس کی زبان میں پوچھا " یہ کون سا گاؤں ہے ؟" "کوئی گاؤں تو نہیں پڑتا بیچ میں" میرے ملازم نے کہا کہ گاڑیبان تو یہ کہتا ہے ۔ اس کے انداز بیان سے تعجب ظاہر ہو رہا تھا۔ چراغ قریب ہو رہے تھے ...... میں نے ٹیکہ چھوڑ دیا ۔ آنکھیں صاف کیں ..... اور اس طرف گھور گھور کر دیکھنے لگا ۔ بازو کے جھنڈ سے کوئی جانور فنور کرتا ہوا بھاگا ۔ جنگل کے کیڑے پوری قوت سے اپنی کرخت آواز سے جنگل کو پرشور کر رہے تھے ۔

ایسا دکھائی دیا کہ وہ چراغ نہیں ہیں بلکہ چند مشعلیں ہیں جو آہستہ آہستہ آگے بڑھتی جا رہی ہیں ..... اور قریب ہوتی گئیں ایسا دکھائی دیا گویا کوئی ان مشعلوں کو تھامے ہوئے ہے ۔ کون ..... ؟ روشنی کے باوجود میں نہ دیکھ سکا ۔ ملازم بھی حیران تھا گاڑیبان بھی کچھ بڑبڑا رہا تھا ..... میں نے اپنی بندوق ٹٹولی شکاری چاقو کی موجودگی کا یقین کر لیا ۔ اور پھر ان مشعلوں کی طرف دیکھنے لگا ۔ مشعلیں اب ہماری بنڈی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں ۔ گاڑیبان نے بہت زور زور سے آوازیں نکالنی شروع کیں

ملازم نے پوچھا "کیا ہے ؟" میں بھی سوچ رہا تھا "یہ کون ہیں؟ کیا ہیں؟"
وہاں کچھ بھی نہ تھا..... نہ مشعلیں تھیں..... اور نہ کچھ اور..... میں اپنی آنکھیں
ملنے لگا..... ارے وہ تو پھر موجود تھیں۔ پہلے کے فاصلے پر آبادی کے چراغوں کی طرح.....

گاڑیبان پھر گانے لگا۔ "آتی ہے تو آ..... پہاڑ کے اس پار" اس کی آواز
میں تھرتھراہٹ تھی..... ملازم نے مطلب بیان نہیں کیا۔ میں نے بھی گنگنانا شروع کر دیا
مشعلیں پھر قریب ہوتی گئیں..... اس قدر قریب کہ..... بیلوں کے سینگ چمکنے لگے.....
بیل نیچی گردن کئے بنڈی کو گھسیٹ رہے تھے۔ میں نے گھبراہٹ کے لہجہ میں ملازم سے
کہا....." دیکھو یہ کیا ؟" ملازم نے گاڑیبان کو جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا ہے ؟"
اس نے اور زور سے گانا شروع کر دیا..... مشعلیں ہم کو گھیرے ہوئے تھیں۔ بنڈی
جاترا کی رتھ بنی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں..... میرے دماغ میں
مَن سے ایک خیال پیدا ہوا..... میں نے لحاف اپنے اطراف لپیٹ لیا۔ جاڑے کی
شدت سے دانت بج رہے تھے۔ مشعلیں ناچ رہی تھیں..... اور
قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ ہم سب کو جلا ڈالنے کے لئے........ میں نے
ملازم سے صرف اتنا کہا "چڑیل" اور میری گھگی بندھ گئی ——— ایک
خوفناک قہقہہ کی آواز اور پھر اس طرح کی کئی آوازیں..... سامنے بہت دور
چند چراغ جھلملاتے نظر آ رہے تھے۔ ملازم نے آہستہ سے کہا "گاڑیبان
کہتا ہے اب ان کی حد ختم ہو گئی....."

مگر اس وقت میں ایک چڑیل کے آہنی پنجے میں اپنی زندگی کے لئے ہاتھ
پیر مار رہا تھا ۔ اور وہ اپنے سفید لا بنے لا بنے دانت نکالے مجھے چبا ڈالنے کی
نیت سے جھکی ہی تھی کہ میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی ۔ مجھے کسی کے جھنجوڑنے
کا احساس ہوا ۔ میں نے اور ایک چیخ ماری ۔ آنکھیں کھولتا ہوں تو میرا ملازم
مجھے ہوشیار کر رہا تھا ۔ "وہ دیکھئے نا صاحب اسٹیشن آگیا" اس نے جھلملاتے
چراغوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ میں دیدے پھاڑے ان چراغوں کو
گھور رہا تھا ۔

دعوت

خوشی کی تقریب ہو یا غم کی زنانے میں ہمیشہ گڑبڑ ہی ہوگی۔ دسترخوان بچھنے سے پہلے سواریوں کے اترنے کا ہنگامہ ہوتا ہے۔ تو دسترخوان بڑھنے کے بعد سواریوں کے جانے کا۔ بیگم صاحبہ اپنی ماما کو چیخ چیخ کر کہہ رہی ہیں کہ تانگہ میں جو تارہ گیا ہے وہ نکال لا۔ ماما کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی، کھڑی اپنی سہیلیوں سے باتیں کررہی ہے۔ ان بیگم صاحبہ کے تانگہ کو دوسری سواری آنے کی وجہ سے ہٹادیا گیا تو بھی بیگم صاحبہ وہیں ننگے پیر کھڑی ماما کو صلواتیں سنا رہی ہیں۔ ایک نووارد بیگم صاحبہ کا حال سنئے۔ اطمینان سے اتر سکتی تھیں۔ پردہ پکڑلیا گیا تھا۔ تانگے والے کو بھی جلدی نہ تھی۔ لیکن اس گھبراہٹ سے اترنے لگیں گویا ذرا سی دیر ہوئی اور تانگہ آگے بڑھا۔ ساری کا پلّو پیر میں اٹک گیا۔ پائدان پر پاؤں آنے کے بجائے وہ خود چیختی چلاتی زمین پر آرہیں۔ ساری عورتیں جمع ہوگئیں۔ چند مستعد عورتوں نے پلّو کمر کے اطراف کس لیا۔ اوران کو پھرتی سے اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔ وہ بیگم ہیں کہ جھینپی جارہی ہیں چہرہ شرم سے سرخ ہو رہا ہے۔ کپڑے جھٹکتی جاتی ہیں، اور کنکھیوں سے مجمع کو دیکھتی جاتی ہیں۔ کہ اتنے میں پہلی بیگم صاحبہ کو ان کی ماما دکھائی دیتی ہے بیچاری پر برس پڑیں۔ دھکے دے کر باہر نکالا۔ کہ "جا میرا جوتا لے آ نہیں تو مارے جوتیوں کے سر توڑ دوں گی"۔ سب کی توجہ اس طرف مبذول ہوگئی۔ اور گرنے والی بیگم صاحبہ

آنکھ بچا کر کھسک گئیں ۔ وہ ماما ہے کہ برابر چیختی جا رہی ہے " ارے او تانگے والے" مگر تانگے والا ہو تب جواب دے نا ۔ اس طرح وہ اپنا حلق پھاڑ کر بری صورت بنائے اندر آئی ۔ اسے خالی ہاتھ دیکھ کر بیگم نے سچ مچ اس کی گُندی کرنی شروع کی ۔ ماما کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ اپنی اپنی جگہ جا کر بیٹھی ہوئی عورتیں پھر سے دروازے کے پاس آکر جمع ہو گئیں۔ " ارے کیا بات ہے؟" " ارے کیا بات ہے؟" ہر ایک کی زبان سے نکل رہا تھا ۔ ماما کچھ کہتی تو بیگم اس کو کاٹ دیتیں اور بیگم کچھ کہتیں تو ماما اُسے غلط بتاتی اور معاملہ رفع دفع اس وقت تک نہ ہوا جب تک کہ خود تانگے والے نے دروازہ پر آکر نہ پکارا " جوتا لے جاؤ" مجمع منتشر ہو گیا۔ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگ گئی ۔ کوئی اپنی ساڑی کی قیمت بتانے میں مبالغہ سے کام لے رہی ہے ۔ تو کوئی اپنے زیوروں پر ہر پہلو سے روشنی ڈال رہی ہے ۔ اب جن کے پاس نہ تو زیور ہی کوئی قابل ذکر ہوتے ہیں اور نہ کپڑے، تو وہ اگر جہلم ہو تو مرحوم یا مرحومہ کے تذکروں سے دل بہلاتے ہیں یا اگر شادی ہو تو دلہن پر تنقید ہونے لگتی ہے ۔ یا دولہے پر نکتہ چینی ہونے لگتی ہے ۔ غرض یہ کہ ہر کونے میں دو دو چار چار کی محفل جمی ہوئی ہے اور ہو رہی ہے بحث ۔

بچوں کے رونے نے تو اور بھی غضب ڈھا دیا۔ جہلم ہو تو یہ رونا کچھ با موقع ہی معلوم ہوتا لیکن شادی میں ان کا اس طرح حلق پھاڑ پھاڑ کر چلّانا ضرور ناگوار گزرتا ہے ۔ جن عورتوں کو ابھی بچے نہیں ہوئے وہ ناک بھوں چڑھا کر ان بچوں کی

ماؤں کی طرف دیکھتی ہیں۔ "سنبھال نہیں سکتے تو پیدا ہی کیوں کیا؟" ایک اپنا منہ پھیرتے ہوئے کہتی ہیں "عجب ساڑھے ساتھی بچے ہیں" دوسری کہتی ہے بیچاری ماں ان کے چلے سنتی اور آپ ہی آپ کڑھتی ہے اور بچے نے بدقسمتی سے اور بھی ضد کی تو سمجھئے کہ ماں یہ ٹھان کر اٹھتی ہے کہ "آج وہ نہیں یا میں نہیں" ایسا "دست بردا شتہ" نوازا جاتا ہے کہ "بچے بیچارے" کی گھگی بندھ جاتی ہے۔ کسی نیک بخت نے بیچ بچاؤ کیا تو خیر، ورنہ اللہ دے اور بندہ لے۔ تاوقتیکہ بچہ روتے روتے تھک نہ جائے۔ ماں کا ہاتھ نہیں رکتا۔ سچ ہے دنیا کو کسی پہلو قرار نہیں وہ اپنے بچے کو بہلا پھسلا کر چپ کرا رہی تھی تو ایک نے چپکے سے کہہ ہی دیا تھا کہ "لاڈ لاڈ میں بچے کو کہیں کا نہ رکھا" اور اب جب کہ لاڈ کی دھجیاں اڑا دی گئی تھیں کہا گیا۔ "ننھی سی جان پر اتنا ظلم خدا ایسوں کو بچے ہی نہ دے" ماں کا مارے پیچ و تاب کے برا حال ہوتا ہے۔ بس چلے تو ایک ایک کو کچا ہی چبا جاتی۔

جوان لڑکیوں کا تو کچھ عجیب ہی رنگ ہوتا ہے۔ مجال ہے جو کوئی ایک بھی کسی بڑی بوڑھی کے ساتھ نظر آئے۔ شوخ شوخ رنگ کی ساڑیاں پہنے۔ بالوں کو نئے نئے طریقوں سے بنائے، آدھی آستینوں کے "بلاوز" زیب تن کئے۔ چہرہ کو مختلف قسم کے پوڈر اور پینٹ سے گلنار کئے۔ اِدھر اُدھر پھر رہی ہیں۔ دو قدم چلے اور باریک ریشمی دستی سے چہرہ صاف کیا اپنی ہمجولیوں سے ملتی ہیں۔ اور اس طرح ایک اچھی خاصی پارٹی بن جاتی ہے۔ جن میں سب ایک دوسرے کے ہم خیال اور ہم عمر

کوئی قسمت کی ماری بڑی بوڑھی ان کے نرغے میں آگئی تو بس سمجھ لیجئے کہ وہ بڑھیا ہاتھ سے گئی ۔ پہلے تو اس کا راستہ کسی نہ کسی طرح روک دیتی ہیں ۔ پھر ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر وہ قہقہے لگاتی ہیں کہ وہ بیچاری آفت کی ماری ۔ بوکھلا جاتی ہے اس کی جھریاں سخت ہونے لگتی ہیں ۔ کلبلا کر چیخ اٹھتی ہے ۔ "کیوں ری چھوکریو! اتنی بے شرمی پر اتر آئیں"۔ "کیا ہے نانی"۔ ان میں سے ایک نہایت ادب سے پوچھتی ہے "تیرا سر، چل چپ، بڑی آئی ہے ۔ نانی کی نواسی ۔ تیری نانی ہوگی کوئی"۔ اس پر ہنسی کے ایسے دورے پڑتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی ۔ اِدھر اُدھر بیکار پھرنے والیاں آکر اس جگہ کھڑی ہو جاتی ہیں ۔ "ارے رے بیچاری کو کیوں ستا رہے ہو"۔ ان میں سے ایک ہمت والی کہتی ہے ۔ ایک نہ شد دو شد کا مضمون ہوتا ہے ۔ یہ پارٹی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے ۔ ایک تو وہ بڑھیا سے نپٹتی رہتی ہے اور دوسری اس مداخلت کرنے والی کی خبر لیتی ہے ۔ "تم سے کون لسر آئے گا" کہہ کر ہمدردی کرنے والیاں چلتی نظر آتی ہیں ۔ اور وہ بڑھیا بھی کسی نہ کسی طرح اپنا پیچھا چھڑاتی ہے ۔ اور اپنے ساتھ والیوں میں جا کر ہی دم لیتی ہے ۔ ایک بوڑھیا اپنے پوپلے منہ کو کئی جگہ سے بگاڑ کر کہتی ہے ۔ "خدا کی مار کیا چھوکریاں ہیں ۔ نہ بڑوں کا خیال نہ چھوٹوں کا لحاظ ۔ دو چار حرف کیا پڑھ لیا کہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتیں ۔ میں تو کہتی ہوں یہ خانداں کا نام روشن کریں گی ضرور"۔ دوسری نے عینک ٹھیک کرتے ہوئے کہا ۔ "لو بہن ۔ بھلا، ان بوا رحیمن نے ان لڑکیوں کو چھیڑا ۔ گالی دی ۔ کیا کہا ۔

ایسا دق کیا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ میں تو کہتی ہوں یہہ لڑکیاں بازاری عورتوں کو بھی نیچا دکھائیں گی۔" "لو دیکھو وہ ایک پرکالہ اِدھر ہی آرہی ہے۔" ایک جوان لڑکی اٹھلاتے ہوئے ان کے قریب سے گزرتی ہے۔ اور ایک کو دیکھ کر ہنستی ہوئی کہتی ہے "پوتھی کے لئے تیار رہو" اور چوکڑیاں بھرتی ہوئی اپنی فوج میں چلی جاتی ہے۔ ان لڑکیوں کو جب کوئی "شکار" نہیں ملتا تو ایک علٰحدہ کمرے میں جمتی ہیں۔ سینما اور دوسرے موضوع پر بحث ہونے لگتی ہے۔ "وہ کھیل مجھے بالکل پسند نہیں آیا۔ یعقوب کی ایکٹنگ تھی تو اچھی مگر وہ تو بالکل بھونڈا ہے۔ صورت نہ شکل"۔ دوسری نے کہا "مایا بڑی اچھی ہیروین ہے"۔ تیسری نے سارے ایکٹروں کی شکل و صورت کا خاکہ اڑایا۔ ایک نے کسی فلم کے مزاحیہ حصے کی نقل کی۔ سب ہنسنے لگیں ایک نے فلمی گانے کی نقل کی۔ سب سنتی رہیں اور گانا ختم ہونے پر" واہ ادما دیوی واہ" کا غل ہوا۔ ایک نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا "اچھا وہ اسکول کے ڈرامے کا کیا ہوا"۔ "تیاری ہو رہی ہے"۔ "تم نے بھی کوئی حصہ لیا ہے"۔ "ہاں۔ ہوں نا۔ شیطان کی خالہ کا پارٹ میں ہی کر رہی ہوں"۔ "تو پھر شیطان کا خالو میں بنوں گا" ایک شریر لڑکی نے کہا۔ اس پر تو اِس زور کے قہقہے لگائے گئے ـــــ کہ لڑائی کا شبہہ ہونے لگا اس کے تھوڑی دیر بعد انتظام کرنے کا بلاوا آتا ہے۔ دو چار اٹھنے کو ہوتی ہیں تو دوسری پکڑ دھکڑ کر بٹھاتی ہے "بیٹھو بھی ایک ہم ہی رہ گئے ہیں کام کرنے کو" پھر دوبارہ بلایا جاتا ہے۔ لیکن اس دفعہ کھانے کے لئے یہہ "چلو، چلو" کہتی ہوئی اٹھتی ہیں

دستر خوان پر بیٹھتی ہیں تو اپنی پارٹی ہی میں سارا دستر خوان بانٹ لیتی ہیں۔ میٹھے سموسے
اور مرغ کی رکابیاں انھیں میں گھومتی رہتی ہیں۔ دوسری عورتیں منہ دیکھتی رہتی ہیں
اور کسی نے ہمت کر کے مانگا بھی تو جواب دیا گیا "کیا بہن اتنی بھی بے صبری" چلئے وہ
بیچاری اپنا سا منہ لے کر رہ گئی اور ساری رکابیاں صاف ہو تی گئیں۔ کوئی میزبان
اس طرف آ نکلے تو سب سے پہلے یہی چیخیں گی کہ "سموسے کہاں ہیں میٹھا تو آیا ہی نہیں"
کھانے کے بعد ان کی پارٹی منتشر ہو جاتی ہے۔ چند کپڑے بدلنے میں لگ جاتی
ہیں۔ چند چہرہ کی زیبائش میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ جانے کا وقت بھی قریب ہوتا ہے
ہنگامہ پھر شروع ہونے لگتا ہے۔ "ارے میرا قمیص کیا ہوا" "اور پاندان کہاں ہے"
"میرا ایک جوتا دکھائی دیا؟" بڑی مشکل سے دروازہ تک آتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ
سواری آگئی۔ یہ سوار ہو گئیں۔ اور اس کے بعد معلوم ہوا کہ دوسرے محلے کی سواری ہے
چلئے بڑبڑاتی بری صورت بنائی ہوئی وہ بیگم صاحبہ اتریں اور اپنی سواری کا انتظار
کرنے لگیں۔ لڑکیاں اپنی اپنی بڑی بوڑھی عورتوں کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ بالکل
بھیگی بلی کی طرح۔ سعادت مندی ہر ہر حرکت سے ٹپکتی رہتی ہے۔ بیٹھیں گی تو ادب سے
بات کریں گی تو قاعدہ سے۔ دوسری لڑکیوں کو برا بھلا بھی کہا جا رہا ہے۔ کہ نہایت
بدتمیز ہو گئی ہیں۔ اس وقت تو وہ چپ ہو جاتی ہیں۔ لیکن گھر آنے کے بعد کسی نے پوچھا
"کیوں آپ بھی تو تھیں اس شرارت میں" تو سراپا استعجاب بن جائیں گی۔ "کون، میں، نانی ماں میں تو
اس وقت بڑی آپا کے ساتھ تھی"۔ بڑی آپا اس وقت وہاں موجود نہیں تھیں، چھوٹ جاتی ہے۔ لیکن
نانی ماں یہ کہنے بغیر نہیں رہتیں "نہیں بیٹا یہ بہت بری حرکتیں ہیں شریفوں کو زیب نہیں دیتیں"۔

غریب کی زندگی

اب کی دفعہ گرمی کی چھٹیوں میں گھر گیا تو وہاں کچھ نیا ہی رنگ تھا ابھی گھر کے باہر ہی تھا کہ کسی کے گنگنانے کی آواز آنے لگی ۔ "بدل گئی ہے ہوا کس طرح زمانے کی" میں ٹھٹکا ۔ حافظہ پر زور ڈالا ۔ میرے گھر میں تو کوئی اس قدر زندہ دل نہ تھا ۔ اماں جان سے تو یہ توقع نہ تھی کہ وہ اس بری طرح مگن ہو جائیں گی ۔ اور گنگنانے لگ جائیں گی ۔ دوسرے ان کی آواز میں یہ "کھنک" بھی کہاں ؟ میں نے اپنے قدم تیز کر دئے ۔ جلدی سے پردہ اٹھا کر اندر جھانکا ۔ نظروں کے سامنے بجلی کوند گئی ۔ ایک نوجوان لڑکی کسی اجنبی کی حریص نظروں سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھے بالوں کو کنگھی کرنے میں مصروف تھی ۔ بالوں سے کنگھی کو صاف کرنے کے لئے ٹھیرتی تو گنگنانے لگتی اور آواز تیز ہو جاتی ۔ مجھے کچھ حجاب سا محسوس ہوا ۔ میں نے پردہ چھوڑ دیا ۔ کسی اجنبی نوجوان لڑکی کو ایسی بے تکلف حالت میں دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا ۔ میرا دل زوروں سے دھڑکنے لگا ۔ پیشانی پسینہ آلود ہو گئی ۔ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے مجھے تو یقین تھا کہ میں کسی بھاری جرم کا مرتکب ہوا ہوں کھنکار کر آواز کی اور پکارا ۔ "میں اندر آؤں" آواز کے ساتھ ہی چوڑیوں کے بجنے اور کسی کے دوڑنے کی آواز آئی ۔ اندر سے اماں جان نے کہا ۔ " آؤ ۔ اندر آؤ "۔ میں نے اپنی گھبراہٹ کو حتی الامکان چھپایا اور نہایت ادب سے سلام کیا ۔ دعائیں دے کر ہنستی ہوئی کہنے لگیں " اجی برخوردار

اب تو کالج میں تہذیب کی باتیں بھی سیکھ رہے ہو۔ بغیر پکارے اندر نہیں آتے" "جی ہاں" میں نے کھسیانہ پن سے جواب دیا۔ پانچ بج رہے تھے "اری کلثوم چائے لانا" والدہ صاحبہ نے زور سے پکارا۔ اور جواب میں جب "جی آئی" کا نعرہ لگایا گیا تو کہنے لگیں "یہ نئی چھوکری۔ اپنے محلہ کی ہے۔ بیچاری غریب ہے۔ بڑی باتونی ہے۔ شریف بھی بہت ہے" "ہو گی" میں نے بے تعلقی کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ اور "چاء" کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کلثوم ہاتھ میں چائے کا طشت لئے نظریں نیچی کئے آہستہ آہستہ ہماری طرف آئی۔ اس کے بال پریشان تھے۔ چہرے پر کہیں کہیں سفید کف سا لگا ہوا تھا۔ اماں جان نے اُسے نظر بھر کر دیکھا۔ اور تھوڑی دیر بعد مسکراتے ہوئے کہا "اوہو۔ آج صابون سے منہ دھویا گیا ہے" اس جملہ پر تو وہ ایسی شرمائی کہ طشت کو میز پر تقریباً پٹک دیا اور بھاگتی نظر آئی۔ اماں جان نے گفتگو کا رخ میری بورڈنگ کی زندگی کی طرف پھیرا۔ پوچھا کہ مجھے کن کن اوقات میں کھانا ملتا ہے؟ کیا کیا دیا جاتا ہے؟ پسند بھی آتا ہے یا نہیں؟ میں نے ان کی پوری پوری تشفی کر دی۔ اور سفر کی تھکن کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ یہ پہلا وقت تھا کہ مجھے کالج سے گھر جانے میں تھکن کا احساس ہوا ہو' پلنگ پر لیٹ کر میں نے سگریٹ سلگا لیا اور دھوئیں کے بادل اڑانے لگا غالب کے ایک شعر کا مطلب سوچنے لگا۔ اس طرح میں اپنے آپ کو دھوکہ دینا چاہتا تھا۔ اس گنگنانے والی لڑکی کا چہرہ نظروں میں پھرنے لگا۔ "کلثوم" میں سوچنے لگا۔ "نام تو کچھ

غیر شاعرانہ ہے۔ مگر صورت بڑی دلکش پائی ہے۔ ایک بہترین شعر سمجھ لو نا۔" "توبہ ہاں۔ تو، غالب صاحب نے خوب لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب انسان کو توقع ہی نہ رہے تو......" "مگر وہ صابون والا معاملہ تو بڑا دلچسپ رہا کیوں؟ میرا آنا اور اس کا صابون سے منہ دھونا کوئی تعلق رکھتا ہے؟ اماں کے کہنے سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی صابون استعمال کیا گیا ہے۔ کیوں.....؟" "بیشک بیشک۔ جب توقع ہی اٹھ جائے تو کوئی گلہ کیسے کرے؟" اس کے بعد لاکھ کوشش کرتا ہوں کہ توجہ کسی دوسرے موضوع پر مبذول ہو جائے مگر ناکام رہا۔ اور آخر آنکھ لگنے سے پہلے اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ میرے آنے کا اس پر اثر ضرور ہوا ہے۔ صبح کو کوئی آٹھ بجے اٹھا۔ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ نہ سر چکرا رہا تھا اور نہ دل بیٹھا جا رہا تھا وحشت تھی نہ حرارت۔ کیونکہ مرضِ عشق سے متاثر ہونے کی یہی علامات مانی جاتی ہیں منہ دھونے کو پانی، صابون پہلے ہی سے رکھ دیا گیا تھا۔ ورنہ ارادہ تھا کہ میں بھی "کلثوم"، پکارنے کا لطف اٹھاؤں، اور پھر اس کے بعد قصداً لوٹا گرا دوں، اور الزام تھوپ دوں اس کے سر۔ مگر۔ اس حملہ کا موقع ہی نہ دیا گیا۔ میں نے جلدی جلدی منہ دھو لیا اور اپنے کمرے میں آ کر دیکھتا ہوں تو تو ال ہی نہیں دل میں ایک گدگدی سی ہوئی۔ پکارا "کلثوم"۔ آواز میں تھرتھراہٹ تھی اور دل میں یہ اندیشہ کہ اماں جان کچھ کا کچھ نہ سمجھ لیں۔ "تو ال نہیں ہے" میں نے انھیں سنانے کو کہا اماں جان نے کلثوم کو تو ال لے جانے کو کہا اور خود باورچی خانے میں چلی گئیں

تھوڑی دیر بعد ایک "تولیہ" چلتی ہوئی چلی آرہی تھی۔ میں نے تولیہ لینا تو درکنار اس طرف توجہ بھی نہ کی۔ اور اپنے آپ کو اس کی موجودگی سے لاعلم ثابت کرنے لگا۔ اور غیر ارادی طور پر فی البدیہہ گنگنانے لگا "تم تو بہت اچھی ہو۔ اے جلوۂ جانانہ" اس نے آہستہ سے تولیہ کو کرسی پر رکھ دیا اور پلٹی کہ کھسک جائے میں نے آئینہ میں اس کی اس حرکت کو دیکھ لیا اور نہایت اطمینان سے کہا "اِدھر لاؤ" وہ بادل ناخواستہ پلٹی اور تولیہ کو پھر سے اپنے ہاتھ میں لیئے ہوئے میرے ہاتھ بڑھانے کا انتظار کرنے لگی میں انجان بنا کنگھی کرتا رہا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو بڑھا کر گھبراتے ہوئے کہا "لیجئے" میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اور پھر کنگھی کرنے لگا۔ "قربان تیرے آگے ......" میں نے کنگھی رکھتے ہوئے کہا۔ اور پلٹ کر دیکھا "خورشی" تولیہ کرسی پر پڑا ہوا تھا۔ اور وہ جا چکی تھی۔ ایک دم سے میری پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ سوچنے لگا کہ میرا طرز عمل واقعی تکلیف دہ اور میرے رتبہ سے گرا ہوا تھا۔ اور پھر کچھ سوچ کر "خیر، خیر" کہتا ہوا دسترخوان پر جا بیٹھا۔ وہ پانی پلا رہی تھی۔ میں قصداً آہستہ آہستہ کھا رہا تھا۔ اور جب تک اماں جان سامنے بیٹھی رہیں۔ میں نے کلثوم کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اماں جان ادھر ہاتھ دھونے کو اٹھیں اور میں نے اپنا گلاس پانی کے لئے بڑھا دیا۔ وہ آگے بڑھی لیکن میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا میری اس حرکت سے وہ بہت متاثر نظر آئی۔ اس کا رنگ سرخ ہو گیا حالتِ اضطرار میں اس نے اپنے ہاتھ کو دو چار جھٹکے دئے کہ پانی لے لو مگر میں اتنی آسانی سے ٹلنے والا آسامی کب تھا۔ گلاس لینے میں پانی قصداً اوپر گرا لیا

" بھگا دیا تم نے" کہتا ہوا اٹھا اور تھوڑا سا پانی خود بخود اس پر بھی گر گیا۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اور پھر۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ میرے دل میں ہلچل مچ گئی۔ یقین ہو گیا کہ اسے ہم سے دلچسپی ہے۔ اور اگر نہ بھی تھی تو اب پیدا ہو گئی ہے۔ آہستہ سے کہا "پان لے آؤ" اور تیزی سے ہاتھ دھونے چلا اماں جان سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ذرا سا کھٹکا ہوتا اور میں اچھل پڑتا کہ "آئی"۔ تھوڑی دیر بعد ایک پان کا بیڑا میری گود میں آ گرا۔ مگر پھینکنے والی کا پتہ نہ تھا۔

سات آٹھ دن اسی قسم کی دلچسپیوں میں گزر گئے۔ وہ کچھ بے تکلف ہو چلی تھی اور یقین تھا کہ اور کھل جائیں گے ـــــ ایک دن میں نے ڈانٹ بتائی کہ باورچی خانے کا لباس علٰحدہ رکھو یا پھر میرے کمرے میں نہ آؤ۔ اور ایک خوشبودار صابون بھی دے دی کہ اس سے منہ دھویا کرنا۔ اس نے لینے میں پس و پیش کیا تو میں نے منہ بناتے ہوئے کہا "ماروں گا نہ لو گی تو" وہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔ دوبارہ جب مرے کمرے میں آئی تو طبیعت خوش ہو گئی۔ کپڑے بھی بدل دئے تھے اور منہ بھی دھو لیا گیا تھا۔ میں نے کہا "ذرا ہماری شیروانی تو نکال دے" وہ شیروانی نکال لائی اور جب میں پہن چکا تو کہنے لگی "یہ شیروانی اچھی نہیں" میں نے اسے نیچے اوپر دیکھ کر کہا "تو پھر جو اچھی دکھائی دے وہی نکال لاؤ"۔ اس نے ایک دوسری شیروانی جو شاید چمکدار ہونے کی وجہ سے پسند کی گئی تھی پیش کی۔ میں نے وہ شیروانی پہن لی لیکن گھنڈیاں کھلی ہی رکھیں

اور آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا "شیروانی پہنائی ہے تو اب گنڈیاں بھی لگاؤ" اس کے کہنے لگی "واہ" میں نے کہا "تو پھر کہتا ہوں اماں سے" اس کی ایک چوری میں نے پکڑلی تھی۔ میری ایک تصویر اس کے صندوق میں رکھی ہوئی تھی۔ اور اس راز کو سوائے میرے کوئی نہیں جانتا تھا۔ اکثر دفعہ وہ اسی طرح اڑجاتی اور یہ دھمکی بڑی کارگر ثابت ہوتی۔ اپنے چہرے کو شکایت آمیز انداز میں تھوتھلاتے ہوئے وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی اور ڈرتی، شرماتی آگے بڑھی اور کانپتی ہوی انگلیوں سے گنڈیاں لگانے لگی۔ جب وہ آخری گنڈی پر پہنچی تو میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑلیئے اور کھینچ کر اپنے سینے سے لگالیا۔ "تم بہت اچھی ہو" میں نے اس کی ٹھوڈی کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ میرے سارے جسم میں بجلیاں سی دوڑ رہی تھیں۔ آنکھوں میں نشہ کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ میں تیز تیز سانس لے رہا تھا۔ وہ کچھ دیر بلا مزاحمت کئے میری گرفت میں رہی لیکن پھر ایک جھٹکے کے ساتھ مجھ سے علٰحدہ ہوگئی۔ اور بھاگتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ میں بہت دیر تک عالم کیف وسرور میں ڈوبا رہا۔ پھر ایک دم سے یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں اماں جان سے جاکر نہ کہہ دے۔ جانتا تھا کہ اس میں میرا کوئی قصور نہ تھا۔ اگر خود اُسے مجھ سے ملنا منظور نہ ہوتا تو وہ مجھے جھڑک نہ دیتی منہ ہی لگنے نہ دیتی۔ چہ جائے کہ اس کی طرف سے کھلی حوصلہ افزائیاں تھیں میں نے اپنے آپ کو بالکل بے قصور سمجھا۔ پھر خیال آیا کہ کیا ہیرے، جواہرات نمائش کے لئے رکھے جائیں تو انسان چرا ہی لے۔ سوچنے لگا۔ واقعی بڑی بدتمیزی ہوی آج۔

باہر نکلتے ہوئے ڈر ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ دروازے پر اماں جان اور وہ کھڑے میرا انتظار کر رہے ہیں کہ جب نکلا۔ کلثوم رو رہی ہے چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ "یہ مجھے ہر وقت چھیڑتے رہتے ہیں۔ ستاتے رہتے ہیں۔" اور اماں جان ہیں کہ غصے سے بل کھاتی جا رہی ہیں۔ دروازہ ہوا سے بھی حرکت کرتا تو میں سہم سہم جاتا۔ کچھ کچھ اندھیرا ہونے لگا تو اپنی بزدلی پر نفریں بھیجی۔ ہمت کرکے دروازہ میں سے جھانکا۔ اماں جان وظیفہ پڑھنے میں مصروف تھیں۔ میں باہر آگیا۔ مجھ کو دیکھ کر ان کے چہرے پر ذرا سی بھی تبدیلی نہ ہوئی۔ میرے دل سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ مگر کلثوم کا کہیں پتہ نہ تھا۔ "ضرور وہ خفا ہو گئی ہے۔" میں نے سوچنا شروع کیا۔ "دل لگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے" میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ اب اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں گا۔ قسم ہے جو اس سے سیدھے منہ بات کروں ——— اس کو دیکھو۔ ایک معمولی دیہاتی غریب لڑکی۔ اس سے بات کرنا خود میری توہین ہے میں ایک شریف گھرانے کا چشم و چراغ۔ تعلیم یافتہ' یہ تو بوالہوسی ہے ——— میں اپنے طرز عمل کو بدلنے پر شدت سے مائل تھا۔ مگر کلثوم نہ تھی۔ وہی جس کے خلاف اتنی تیاریاں ہو گئیں تھیں۔ وہ دو دن تک نہ آئی۔ تیسرے دن جو آئی تو چہرہ پھیلا ہوا روٹھی ہوئی سی۔ معلوم ہوا کہ اس کا ماموں آیا ہوا تھا اور کوئی دوسری بات نہ تھی میں اپنے لائحہ عمل پر کاربند ہونے کے امکانات پر غور کرنے لگا۔ اس کا یہ طرز عمل میرے احساسات پر ایک کاری ضرب تھی۔ وہ مجھ سے کھنچ کر ملی

اپنی خودداری کو بالائے طاق رکھ کر میں نے اسے پھر متوجہ کرنا چاہا تو۔ بڑبڑانے لگی "آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ میں غریب ہوں کیا اس لئے؟" اس کی آواز بھرّا گئی۔ میرے نزدیک وہ اب کلثوم نہ تھی۔ ایک شریف، باوقار عورت تھی۔ میری نظروں میں اس کی عزت کئی گونہ بڑھ گئی۔ وہ میرے ہم پلہ بلکہ کچھ زیادہ ہی ہو گئی میں نے چہرے پر حزن و ملال طاری کرتے ہوئے کہا "میں تم کو پسند کرتا ہوں" میں نے اپنی آنکھیں اس کی طرف سے ہٹالیں۔" وہ خاموش رہی۔ "میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا" میں نے اس کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے کی کرختگی دور ہوتی گئی۔ "میں تمھارا ہوں"۔ وہ مسکرانے لگی۔ ایک فاتحانہ شان سے وہ میرے قریب ہوگئی۔ اس کے بعد کلثوم وہی پرانی کلثوم تھی۔ مجھ پر نظر عنایت رکھنے والی۔ مجھ کو دیکھ کر مسکرانے والی۔ میرے کمرے میں کام کے بہانے بار بار آنے والی مجھ کو دیکھنے اور خود کو دکھانے کے لئے۔ میرے سنگار میز پر کنگھی کرنے اور بال جمانے کے لئے۔ اور میں۔ وہی۔ اس کو چاہنے والا۔ اس یقین کے باوجود بھی کہ وہ میری بیوی نہیں بن سکے گی

اماں جان سے واپسی کے بارے میں صبح میں گفتگو ہوئی تھی۔ دوپہر کے وقت کلثوم میرے کمرے میں آئی۔ نہایت بے تکلفی سے میرے بازو پلنگ پر لیٹتے ہوئے اور مزید عنایت یہ کہ چار پانچ بیڑے مجھے کھلا دئے اور شرماتے ہوئے کہنے لگی "میں بھی اب ساتھ چلوں گی" میں نے ہنستے ہوئے کہا "اماں سے اجازت لاؤ" "میری" اس نے تیزی سے پوچھا۔ "جی نہیں میری" اور میں نے اس کی انگلی میں اپنی انگوٹھی پہنا دی ——

"میری نشانی سمجھ کر پہنی رہو" میں نے اس کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔ اس نے انگوٹھی کو اور پھر مجھے دیکھا۔ منہ بنا کر کہنے لگی "اب تو ضرور چلوں گی میں یہاں نہیں رہنا چاہتی" اماں جان اسے پکار رہی تھیں۔ وہ میری طرف دیدے پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ میں نے گردن سے اشارہ کیا کہ "بھاگ" وہ ڈرتے ڈرتے، بار بار مجھے دیکھتے باہر چلی گئی۔ اس کے باہر ہوتے ہی میں دروازے کے قریب آگیا۔ اماں جان اسے ڈانٹ رہی تھیں "کیوں ری تیرے چونچلے تو اب بڑھتے ہی چلے" مجھے یقین ہو گیا کہ راز فاش ہو گیا۔ اور عالم اضطراب و کشمکش میں ٹہلنے لگا۔ "اماں جان کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں" میں نے ان کے "چونچلے" کہنے پر غور کرتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا۔ میں اپنے نزدیک بالکل بے قصور تھا فیصلہ کر لیا کہ اگر کچھ ٹیڑھی باتیں ہوئیں تو فوراً بدل جاؤں گا۔ نہایت دیدہ دلیری سے کہہ دوں گا "کیا آپ نے مجھے اتنا کمینہ سمجھا ہے" اور سارے اونچ نیچ سمجھ لئے۔ اپنے بچاؤ کے سارے پہلو سوچ لئے۔ باہر آیا۔ اماں جان سے بغیر کسی جھجک کے آنکھیں ملائیں۔ کچھ اکھڑی اکھڑی سی گفتگو رہی۔ وہ انجان سی بنی رہیں۔ اور میں نے بھی مصلحت اسی میں دیکھی کہ خاموش رہوں۔

اس کے بعد کلثوم سے آنکھ ملاتے ہوئے بھی ڈر ہوتا تھا۔ اماں جان کی آنکھیں ہر دم میری طرف لگی رہتیں۔ صبح سے شام تک وہ میرے کمرے کی چوکسی کرتی رہتیں اور میری حالت بالکل ایک قیدی کی سی تھی۔ ایک دفعہ بڑی مشکل سے کلثوم کو میرے کمرے میں آنے کا موقع ملا۔ یہ کہہ کر ٹال گئی۔ "تمھاری اماں خفا ہو رہی تھیں" میں نے

اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "تم بالکل نہ ڈرو" میں نے ہمت افزا لہجہ میں کہا۔ اور اس کے ہاتھ میں پانچ روپے کی نوٹ رکھ دی۔ اس نے لینے سے انکار کیا۔ مگر میں نوٹ کو اس کے ہاتھ میں پکڑاتا آواز کرتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ تعطیلات ختم ہو رہے تھے۔ جاتے وقت وہ پہلے ہی سے باہر کھڑی تھی۔ میری طرف حسرت سے دیکھتے ہوئے۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک کر میرے قدموں میں گرے۔ میں نے اسے دم دلاسا دیا "اب بہت جلد آؤں گا" اور اس کی تھوڑی پکڑ کر آنکھیں ملاتے ہوئے پوچھا "تیرے لئے کیا لاؤں" "میرے لئے" اس نے اک آہ کھینچ کر کہا اور اندر چلی گئی۔ دل کے خلاف ایک زبردست جنگ کرتا ہوا میں تانگہ میں سوار ہوا۔ اور چلا آیا۔

کالج میں اب دل کیسے لگ سکتا تھا۔ رہ رہ کر اس بھولی بھالی لڑکی کی یاد آتی اور بڑی بے چینی سے تعطیلات کا انتظار کرنے لگا۔ کالج دس دن کے لئے بند ہو رہا تھا۔ میں نے چار دن پہلے ہی سے تعطیلات منانے شروع کئے۔ میں پھر اپنے گاؤں میں تھا۔ کلثوم کے لئے دو چار تحفے بھی ساتھ رکھ لئے تھے۔ گھر میں داخل ہوا ــــ دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ مسکراہٹ بار بار لبوں پر کھیل جاتی تھی مگر...... کلثوم کا کہیں پتہ نہ تھا اماں جان نے اتنی جلدی واپس آنے پر تعجب کا اظہار کیا میں خاموش رہا اور انھیں "ہوں" "ہاں" کہہ کے ٹالتا ہوا سارا گھر چھان مارا۔ کلثوم ہو تب ملے نا۔ میں بہت جھنجلا گیا۔ اماں پر بہت غصہ آیا۔ شبہ شبہ میں بیچاری نکال دی گئی میں نے اس کے لائے ہوئے تحفوں کو توڑ مروڑ کر ایک کونے میں پھینک دیا اور افسوس کرتا رہا کہ

کیوں آیا؟ اماں جان نے طبیعت کے بارے میں پوچھا میں نے کہہ دیا "اچھا ہوں" جس پر انھوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت بھرے لہجہ میں پوچھا "اداس ہو" "جی ہاں۔ آج ہر چیز اداس ہے۔ خود آپ بھی اداس معلوم ہوتی ہیں۔ سارا گھر سنسان دکھائی دیتا ہے کچھ خالی خالی سا" اماں جان نے ہنستے ہوئے کہا "ہاں! اور تو کوئی کمی نہیں۔ سوا ے اس کے کہ کلثوم نہیں ہے۔" اور مجھے متوجہ دیکھ کر تھوڑے وقفہ سے کہا "اس کی شادی ہوگئی۔ اس کے ماموں کے بیٹے سے۔" میں نے گردن ہلاتے ہوئے "اچھا" کہا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اماں جان کے چلے جانے کے بعد میں سچ مچ رونے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے اس شادی کی ضرور ہی مخالفت کی ہوگی۔ روئی ہوگی مجھے یاد کیا ہوگا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ جو شادی کردی گئی۔ کلثوم!!

تمام دن گھر میں بیکار پڑا رہتا۔ وحشت سی ہونے لگی اور بھاگنے کی سوجھ رہی تھی ایک دن میں بیٹھا خود اپنی شادی کے امکانات پر غور کر رہا تھا کہ..... کلثوم شادی کے کپڑوں میں ملبوس میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آتا تھا اس نے دوڑ کر میرے پاؤں پکڑ لئے بلک بلک کر رونے لگی۔ "میری شادی ہوگئی میں بہت روئی۔ وہ شرابی ہے۔ اسے بات تک کرنی نہیں آتی۔ مجھے تمھاری یاد آتی ہے میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔" وہ کھڑی ہوگئی۔ اس کی آواز بلند ہوتی گئی۔ "تم نے مجھے ٹھکرا دیا۔ غریب ہوں، مجبور ہوں تم سے محبت کرتی ہوں اس لئے۔ اب تم ہی کہو۔ میں کیا کروں؟" میں نے اس کے آنسو صاف کئے۔ میری حالت خود قابل رحم

ہورہی تھی۔ میں نے رکتے رکتے کہا "تم۔ خواہ مخواہ گھبراتی ہو۔ شادی سے کیا ہوتا ہے۔؟
تم ہمیشہ میری رہوگی"۔ میں نے اپنے لہجہ میں وثوق پیدا کرلیا۔ وہ خاموش سنتی رہی۔
پھر اپنے بازوؤں کو ننگا کرکے مار کے نشانات بتائے۔ اپنی صحت کی خرابی کی طرف
متوجہ کیا۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی "اور چند دن یہی حالت رہی تو مرجاؤں گی"
میں نے جوش میں آکر کہا "میں اس مردود سے سمجھ لوں گا"۔ دالان میں سے اماّں جان
کے قدموں کی آواز آنے لگی۔ میں اس کو دوسرے دروازے سے آنے کی ہدایت کرتا ہوا
باہر آگیا۔ تفریح سے واپس ہورہا تھا۔ راستہ میں ایک شخص، میلے کچیلے کپڑے پہنے
داڑھی بڑھی ہوئی۔ سر پہ ایک بڑا سا شملہ۔ مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا
"تم کون ہو" ہنستے ہوے کہنے لگا "کلثوم کا خاوند ہوں"۔ میں نے تیوری چڑھائی
کلثوم کے ہاتھ کے نشانات آنکھوں میں پھرنے لگے اس کی بیمار صورت دکھائی دی ۔
"کیوں جی تم اس بیچاری کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتے ہو؟" میں نے غصیلی آواز
میں کہا۔ "غلط ہے سرکار۔ وہ مجھے یوں ہی بدنام کرتی ہے۔ آپ نے اس کی باتیں
نہیں سنیں۔ پوڈر، تیل، کنگھی، نرم نرم بچھونے میں کہاں سے لاوں۔ غریب آدمی ہوں
جو، باجری کی روٹی کھانا پڑے گی۔ موٹا ڈھوٹا پہننا پڑے گا۔ بس لڑائی اتنی بات کی ہے
اب جو فیصلہ آپ کا"۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوے کہا "تم مرد ہو، عورت کو محبت سے رام کرنا
سیکھو۔ وہ درست ہوجائے گی"۔ اس نے مجھ پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور چلتا بنا۔
اس کے بعد کلثوم سے ملنے کا اتفاق ہوا اور نہ اس کے خاوند سے مگر

اتنا ضرور معلوم ہوا کہ وہ مجھے بدنام کرتا پھر رہا ہے۔ اس گاؤں سے مجھے نفرت ہے میں تعطیلات میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ ارادہ ہے اماں جان ہی کو شہر بلوا لوں۔ اس گاؤں کے رہنے والے ایک صاحب سے اتفاقاً میری ملاقات ہوگئی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد انھوں نے نہایت رازدارانہ لہجہ میں کہا "کلثوم بھاگ گئی"۔ مجھے یہ سن کر بڑا دکھ ہوا۔ میں اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ میں نے ہی اسے محلوں کے خواب دکھائے۔ اس دنیا کی سیر کرائی جہاں اس کے خیال تک کی رسائی نہ تھی۔ میں نے اسے محبت کرنی سکھائی۔ اور اس کے عوض اس کا سکون۔ آرام واطمینان گھر بار سب کچھ چھین لیا۔ مجھے امید تھی کہ وہ ضرور میرا پتہ اٹھائے گی اور میرے پاس آئے گی

ایک دوست سے ملنے گیا۔ میرے ہوش وحواس پر جیسے بجلی گر پڑی کلثوم ایک چھوٹے بچے کو گود میں لئے۔ میرے سامنے سے گزر گئی۔ اتنے میں میرا دوست بھی آگیا۔ کہنے لگا "کیوں؟ کیسی ہے یہ ہماری نئی آیا" "مبارک" میں نے ٹالتے ہوئے کہا "بڑی مشکل سے ہاتھ لگی ہے۔ مگر یار تعجب ہوتا ہے۔ گاؤں والیوں میں بھی اتنا تمیز اتنی شرارت اور دل موہ لینے کے ڈھنگ ہوتے ہیں"۔ وہ ہنسنے لگا۔ میں نے خون کے گھونٹ پیتے۔ صرف "جی ہاں" کہا اور دوبارہ کبھی اس کے گھر نہ گیا۔

بیوہ

موت پر کس کا زور چل سکتا ہے، بنواری لال تھوڑی سی علالت کے بعد تیس سال کی عمر ہی میں مرگیا..... ایک بیوی کو دنیا سے اس ناانصافی کی شکایت کرنے کے لئے زندہ چھوڑتے ہوئے ...... ایک نوجوان بیوی کو جس کی امیدوں اور آرزوؤں کے چراغ اپنی پوری روشنی سے اس کے دل کو منور کر رہے تھے ..... شیلا اب بیوہ تھی عورت ہونے کا حق اس سے چھین لیا گیا تھا..... وہ اپنے خاوند کی قاتلہ سمجھی جانے لگی ایک بیوہ سب کچھ سمجھی جاتی ہے ...... سولہ سترہ سال کی الھڑ، ہر دم خیالی دنیا بسانے والی نادان لڑکی کو ایک دم سے یہہ باور کرایا جائے کہ "تو بیوہ ہے" کس قدر ہیبت ناک اور دل ہلا دینے والا ہوتا ہے، مرنے والے سے زیادہ اسی کا غم شیلا کے لئے سوہان روح تھا، وہ چاہتی کوئی اسے تسلی دے اس کی اشک شوئی کرے، اور اسے طعن وتشنیع کرنے والی زبانیں چبھتی ہوئی قہر آلود نظریں..... چاروں طرف سے گھیری رہیں۔

سسرال میں اب اس کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، خاوند کو کھا جانے والی کا ٹھکانہ کہاں ہو سکتا ہے ؟ زندگی تک اس کے چرنوں میں اور مرنے کے بعد..... وہ جہاں ہو وہیں..... دنیا میں ؟ کس کے ساتھ ؟ کیوں ؟..... شیلا روتی تھی ..... اپنے سر کے بال نوچ ڈالے تھے، کھانا چھوڑ دیا تھا، پھر بھی ..... یہہ سب ڈھونگ تماشے سمجھے گئے کہا گیا کہ "بڑی مکار ہے، منحوس ہے ....." وہ اور بھی زیادہ رونے لگی ......

سسرال سے نکال دی گئی، شیلا سسرال سے نکال دی گئی .... ایک منحوس

ہمیشہ نڈھال رہنے والی لڑکی کو کون اپنے گھر میں رکھ سکتا ہے جب کہ اس گھر میں شادی، پوجا، سالگرہ ہوتے ہوں، چھوٹے چھوٹے بچے ہوں..... ساس نے صاف کہہ دیا "جاؤ اپنی ماں کے پاس میرے گھر میں تو اب رہنے کی ضرورت نہیں....... میرے بیٹے کو کھا گئی. . . . اب اور کسے کھائے گی" بیچاری کی آواز بھرا گئی...... سننے والوں کو بھی ترس آگیا..... شیلا کے سر پر سبھوں نے اس کے پاپ کی گٹھڑی کی طرح میلے کچیلے کپڑے رکھ دے اس پر دروازے بند ہوتے گئے......

شیلا کی ماں بہت دن ہوئے مرچکی تھی...... اس کے باپ نے دوسری شادی کی اور اس شادی کے کچھ دن بعد ہی دنیا سے منہ موڑ لیا...... اپنی پہلی بیوی کے پاس چلا گیا، شیلا کی سوتیلی ماں ایک چھوٹے سے مکان میں رہا کرتی اور اسے شیلا یا شیلا کے معاملات سے بہت کم تعلق ہوتا۔

وہ مکان جس میں شیلا اب جارہی تھی، اس کے باپ کی وصیت کے مطابق ان دونوں ماں بیٹیوں کا تھا اور وہ کسی غیر کے گھر نہیں جارہی تھی، شیلا کی ماں طبیعت کی کچھ بری نہ تھی..... لیکن..... ایک بیوہ لڑکی کے لئے ماں کا دل بھی سخت ہوجاتا ہے اور وہ بھی سوتیلی ماں کا، ابتدائی دوچار دن کے بعد کے دن شیلا کے لئے کچھ زیادہ امید افزا نہ تھے سسرال سے زیادہ یہاں اسے تکلیف ہوتی تھی..... جو بات غیروں کی زبان سے سنی جائے وہی اگر اپنے بھی دہرائیں تو سننے والے کا دل چھد کے رہ جاتا ہے اس تمام طعن وتشنیع اور بدسلوکی کا اثر کچھ دنوں تک شیلا کے دل پر بہت گہرا داغ بٹھاتا رہا

لیکن اب ..... اسے ان باتوں کو سنتے ہوئے بہت دن ہو چکے تھے..... ان باتوں نے
اس کے کان پکا دئے تھے..... وہ سب کچھ سنتی..... سمجھتی کہ وہ اسی کی مستحق ہے اور
زندگی کے دن بغیر روئے دھوئے گزار رہی تھی..... اس کی ماں نے ایک دن کہا کہ وہ
اپنے کھانے پینے کا علیحدہ انتظام کرلے۔ "ایک بیوہ تیرا بار اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتی"
پھر بھی مکان میں شیلا کا حصہ تھا۔ وہ مصلحتاً خاموش ہو جاتی..... بچا ہوا دینے اور
کھانے میں دونوں کو بہت دن تک کوئی اعتراض نہ ہوا......

شیلا کی ماں کے ہاں ایک لڑکا کھانا کھایا کرتا اور ماہوار چار پانچ روپے جو کچھ بھی
ہو سکتا دے دیتا..... وہ روزانہ دو وقت شیلا کے گھر آتا' اور اب تین چار وقت
آنے لگا تھا' راجہ شنکر مدرسہ میں میٹرک کی تعلیم پاتا تھا' بڑا ہی منچلا' طبیعت میں
شوخی اور شرارت' گانے بجانے کا شوقین' غرض کہ موجودہ زمانے کا نوجوان تھا...
شیلا سے اس نے کبھی کھل کر بات نہیں کی لیکن نظریں..... شیلا کے لئے ان کے راز کی
گہرائی تک پہونچنا مشکل نہ تھا۔ شیلا کی ماں نے ایک دن راجہ شنکر سے کہا "تھوڑی دیر
اگر شیلا کو بھی پڑھا دو تو وہ کہیں دس بیس کی نوکری کرلے گی" شیلا نے بھی اس کو غنیمت
جانا اور دوسرے دن سے تعلیم شروع ہو گئی..... راجہ شنکر کو اب پڑھنے کی فرصت
نہ تھی' وقت بے وقت جب دیکھو وہ شیلا کو پڑھاتا رہتا..... شیلا ذہین تھی اس کی تمام
توجہہ تعلیم کی طرف ہو گئی' اس نے بہت جلد سیکھ لیا لکھنا' پڑھنا..... اور ساتھ ہی پڑھانا
بھی' راجہ شنکر اس کے کہنے پر اپنی کتاب کے دلچسپ حصے اسے سنایا کرتا وہ کبھی کسی بات پر

اڑجاتی یا سننے کے لئے تیار نہ ہوتی ..... "ایک عورت نے مرد کے لئے جان دے دی"
وہ تعجب سے پوچھا کرتی، راجہ شنکر کچھ نہ کہتا.......

شیلا کی ماں چند دنوں تک تو بڑی سختی سے دونوں کی نگرانی کرتی رہی لیکن بعد میں وہ لاپروا ہوگئی...... دونوں کو پڑھنے پڑھانے کی کامل آزادی حاصل تھی ..... محلے والوں نے ناک بھوں چڑھائی..... مگر پروا کرنے والا کون تھا..... کسی تہوار کے موقع پر ایک ناٹک کھیلا جانے والا تھا، راجہ شنکر نے، شیلا کی مدد سے اپنا پورا پارٹ یاد کرلیا تھا، اور اسی کا کام سب سے اچھا رہا......... دوسرے دن شیلا نے ہیروین کا پارٹ خود یاد کرلیا اور کل کے کام کو دوبارہ دہرایا گیا ...... راجہ شنکر ہیرو شیلا ہیروین..... شیلا نے اپنا پارٹ ختم کیا..... اس کی ہمت بڑھ گئی تھی اس نے سوچتے ہوئے کہا" اگر ہم ایسے ہی ایک دوسرے کے ساتھ عمر بھر کے لئے رہیں تو" "کھیل سکتے ہیں اگر....." "میں چاہوں تو نا" شیلا نے ہنستے ہوئے کہا "ہاں" راجہ شنکر کی زبان سے نکلا..... اس نے زمین پر اپنی انگلی سے کریدتے ہوئے کہا" میں تم کو چاہتا ہوں شیلا" شیلا خاموش ہوگئی..... اور چلی گئی..... راجہ شنکر بھی کچھ یاس کچھ امید کی حالت میں گھر چلا آیا......

شیلا اب بننے سنورنے لگی..... اس کے شباب کے دریا میں پھر کسی کا چہرہ عکس افگن تھا کوئی دیکھنے والا ہو تو آرائش کیوں نہ کی جائے۔ شیلا اور شنکر کے درمیان خطوط کا سلسلہ بندھ گیا..... محبت کے خطوط کا، شیلا کی ماں نے ان کی اس چوری کو پکڑ لیا......

وہ ایک بپھری ہوی شیرنی کی طرح شیلا پر جھپٹی، شیلا کو ہر برے نام سے پکارا اور
آخر میں گھر سے نکل جانے کی دھمکی دی، شیلا کے لئے راجہ شنکر کے ساتھ بھاگ جانے کا
خیال فضول تھا اس نے صاف طور پر کہہ دیا تھا "ہمارا اس طرح بھاگ جانا....
دونوں کے لئے خطرناک ہوگا" وہ اتنے بڑے مرحلے میں اپنی عزت اور آبرو کی بازی
لگانا نہیں چاہتا تھا۔ شیلا نے منہ پھوڑ کر اپنی نسوانی حیا اور خودداری کو بالائے طاق
رکھ کر کہا تھا "چلو بھاگ چلیں" مگر راجہ شنکر کا جواب مایوس کن تھا اسے اب ناامیدی
ہوگئی، راجہ شنکر آیا تو شیلا اسے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، روتے ہوے سارے
واقعات بیان کر دیئے۔ راجہ شنکر نے بہت دم دلاسا دیا "اس کو کوئی حق نہیں
گھر تمہارا بھی ہے اور اس کا بھی ..... اب کی دفعہ جو کچھ کہے تو تم اپنا حصہ مانگو....."
راجہ شنکر کی بتائی ہوئی ترکیب کارگر تو ہوی لیکن سختی بڑھ گئی دونوں میں ایک دیوار
حائل کر دی گئی ..... نہ یہہ اس سے ملے اور نہ وہ اس سے ..... پھر بھی جس کو ملنے کی
دھن سمائی ہو وہ کب رکاوٹ کو خاطر میں لاتا ہے۔ وہ بچے جو شیلا کے پاس پڑھنے
آتے تھے، راجہ شنکر نے ان میں سے ایک کو ہموار کر لیا اور اس طرح خطوط کا سلسلہ
برابر جاری رہا..... بعض اوقات وہ مل بھی لیا کرتے..... دونوں بہت بری طرح ایک
دوسرے کو چاہنے لگے تھے..... انجام دل خوش کن نہیں ہوسکتا تھا، راجہ شنکر نے
امتحان دینے کے بعد اپنے گھر کی راہ لی..... اور وہاں اس کی شادی ہوگئی.....
شیلا نے بھی اسے مشورہ دیا تھا کہ "تم شادی کر لو" مگر جس وقت یہہ خبر شیلا کے

کانوں میں پہنچی، وہ سنبھل نہ سکی، آنسوؤں کا دریا اس کی آنکھوں سے بہہ نکلا، یہہ دوسری بیوہ گی تھی، راجہ شنکر کو اس کے سامنے آتے ہوئے جھجک ہوتی تھی.... مگر اس نے اپنی بیوی کو اس کے مدرسہ میں داخل کردیا..... سرسوتی شیلا سے زیادہ حسین نہ تھی مگر وہ بیوہ نہ تھی...... وہ گھنٹوں اس کی صورت دیکھتی اور آہیں کھینچا کرتی......

سرسوتی نے راجہ شنکر سے پوچھا "استانی ماں غمگین کیوں رہتی ہیں" "میں کیا جانوں" راجہ نے اس انداز میں کہا کہ سرسوتی سمجھ گئی "یہہ سب جانتے ہیں" سرسوتی کھنچی کھنچی رہنے لگی۔ راجہ شنکر نے سمجھا کہ شیلا ہی نے کچھ کہا ہوگا وہ ایک دن اس کے پاس گیا، وہ اپنے بال سکھا رہی تھی..... وہ مسکرائی لیکن طنز اس کے لبوں پر کھیل رہا تھا....

"شیلا یہہ تم نے کیا کیا" "میں نے کیا کیا راجہ" "کچھ بھی نہیں" "کچھ بھی نہیں" اس نے نہایت ہی سنجیدہ لہجہ میں کہا اور اٹھ کر جانے لگی، راجہ نے بڑھ کر اس کا دامن تھام لیا..... "سرسوتی کو میری طرف سے صاف کردو....." شیلا چونکی اس کے کانوں میں "سرسوتی کو میری طرف سے صاف کردو" گونج رہا تھا..... "میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا" اس نے اضطراری حالت میں جواب دیا لیکن وہ سوچتی رہی "میں کون ہوں......... ایک بیوہ..... اور سرسوتی سہاگن اس کے خاوند کو کیوں چھین لوں.... مگر... راجہ نے مجھ سے محبت ہی کیوں کی، میں بدلہ لوں گی..... ضرور لوں گی۔ وہ پلنگ پر گر پڑی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر تکیہ میں جذب ہو رہے تھے۔

دوسرے دن سرسوتی آئی..... باتوں ہی باتوں میں راجہ شنکر کا ذکر آیا....

"وہ کس قدر آزاد ہو گیا ہے..... راتوں کو سوتا ہی نہیں.... ہمیشہ کچھ سوچا کرتا ہے"۔ شیلا کے لئے یہ جاننا مشکل نہ تھا کہ وہ کس کے خیال میں گم رہتا ہے...."سرسوتی" اس نے اس کی طرف مترحم نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "ایک بات کہوں برا نہ مانو گی" "نہیں شیلا نہیں ایسا خیال نہ کرنا میں تمھیں اپنی بہن سمجھتی ہوں...." شیلا کو سرسوتی بہن سمجھتی ہے راجہ راتوں کو سویا نہیں کرتا، سوچا کرتا ہے.... اس کے دماغ میں چکر لگانے لگا، شیلا نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا "کچھ نہیں سرسوتی، کچھ نہیں تم راجا کو سنبھال کر رکھو... میں نے اپنے پتی کو کھو کر خود کو کھو دیا...." اُس نے اپنے کو سرسوتی کی گود میں ڈال دیا۔

چند دنوں کے بعد شیلا..... یکایک غائب ہو گئی..... سرسوتی نے اپنے پتی کی طرف دیکھا، اس خبر کو سن کر اس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئی تھیں، اسی رات بنواری لال کی ماں نے خواب میں دیکھا کہ بنواری لال دولھا بنا بیٹھا ہے اس کی شادی ہو رہی ہے۔

اب میں نے جانا ہے

میں امجد کو اس کے بچپن سے جانتی ہوں، اس کے ساتھ کھیلی اس کو مارا بھی اور اس کی مار بھی کھائی۔ اس سے روٹھی بھی اور منائی بھی۔ وہ میرا رشتہ دار تھا۔ میں اس کو امجد بھائی کہتی اور وہ مجھے صرف نازو۔ بچپن گزر گیا۔ میں بھی بڑی ہو گئی اور امجد بھی کافی اونچا پورا ہو گیا۔ مگر اب بھی میرے لئے وہ صرف امجد بھائی ہی تھا۔ وہ ہمارے ہاں کبھی کبھی آتا اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے چلا جاتا۔ میں نے اس کو کبھی ٹھہرنے کے لئے کہا نہ جلد جلد آنے کے وعدے لئے۔ وہ آتا یا نہ آتا مجھے اس کی کوئی پرواہ نہ تھی۔

ایک دن میرے والدین کو میں نے یہ کہتے سنا کہ اگر امجد کے والدین راضی ہو جائیں اور وہ خود بھی پسند کرے تو میری شادی اس کے ساتھ کر دی جائے گی۔ اس کے بعد امجد آیا تو میں اس کے سامنے آتے ہوئے شرمائی۔ اسے خاص نظروں سے دیکھا اور جب وہ جانے کے لئے اٹھا تو میں نے شکایت آمیز انداز میں کہا۔ ”مہینے میں ایک دو دفعہ تو آیا کرو۔“ میں اتنا کہہ کر یہ سمجھ بیٹھی کہ امجد نے میرے دل کی بات جان لی۔ اسے معلوم ہو گیا کہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ کس جذبہ کے تحت ہے۔ اور مجھے اس احساس نے تھوڑی دیر خوش بھی کر دیا۔

دوسرے تیسرے مہینے امجد کے والدین سے اس بارے میں گفتگو کی گئی۔ معلوم ہوا کہ امجد اپنی شادی کا آپ مختار ہے۔ وہ جسے چاہے پسند کر سکتا ہے۔ وہ جس لڑکی سے بھی

شادی کریگا اس میں ان کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ والد نے سمجھایا کہ "یہہ نسبت نہیں ہوسکتی۔ یہہ کہنا نا رضامندی ظاہر کرنے کا نہایت ہی مہذب طریقہ ہے۔ لڑکے کے والدین اس رشتہ کو ناپسند کرتے ہیں اور اس مسئلہ کو یہیں ختم کردینا چاہئے۔" والدہ بھی سمجھ گئیں۔ مگر میری عقل پر پتھر پڑگئے تھے۔ سمجھی کہ امجد کو راضی کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے مجھے کسی وقت کا گمان تک نہ تھا میں اس کے ساتھ کھیلی ہوی۔ اس کی رشتہ دار صورت شکل کی بھی کچھ بری نہیں؟ پھر مجھے امجد کی رضامندی حاصل کرنے میں کون سی دشواری ہوسکتی ہے؟ سوچا کہ کسی نہ کسی دن بچپن کے کھیل اور بچپن کی باتوں کی یاد دلاوں گی خود ہنسوں گی اسے ہنساوں گی پھر یہہ کروں گی۔ وہ کروں گی۔ اور امجد۔ وہ تو میرا ہے

امجد بہت دنوں بعد آیا۔ میں نے اس کی خاطر مدارات میں کافی سرگرمی دکھائی شام کا کھانا کھانے کے لئے روک لیا۔ کھانے کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ میں نے اپنے ہاتھ کا بنا ہوا پان اُسے دیا اُس نے مجھے نظر بھر کر دیکھا اور مسکراتے ہوے پان میرے ہاتھ سے لے کر کھالیا۔ اس کا مسکرانا۔ میرے دل کی دھڑکنوں کا جواب تھا میں سمجھی وہ پھندے میں آگیا، میرا جادو اس پر چل گیا۔ میں نے اس کے مقابل بیٹھتے ہوے پوچھا۔ "یاد ہے وہ گڑیوں کی شادی کے پان" "ارے ہاں وہ نا۔ اچھی طرح یاد ہیں۔ مگر ان میں یہہ بات نہ تھی دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔" "وہ کس طرح۔؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوے پوچھا۔ "اس طرح کہ ان پانوں میں خون کی سی سرخی آتی ہے اور اُن پانوں میں رنگ ہی نہ تھا" کیا یہہ سچ نہ تھا کہ محبت اور خلوص سے جو پان دیا جاتا ہے،

اس میں سرخی بھی زیادہ آتی ہے۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ اپنے آپ کو سنبھالنے لگی امجد شاید کچھ اور کہتا۔ مگر وہ خاموش رہا۔ "اچھا اب شادی کب کر رہے ہو۔ امجد......" میں نے ڈرتے لجاتے پوچھا "پہلے آپ کی۔ یا پھر دونوں کی ایکدم" "دونوں کی ایکدم" میں۔نے سوچنا شروع کیا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے یقین تھا کہ امجد سے اگر میرے بارے میں پوچھا جائے تو وہ انکار نہیں کرے گا۔

امجد اب میری نظروں میں دیوتا تھا۔ اس کی ذری سی باتیں اس کے خیال کو گھنٹوں میرے سامنے رکھتیں۔ وہ کس قدر خاموش اور محنتی تھا۔ اس نے کئی دفعہ مجھے سخت سست صرف اسی وجہہ سے کہا تھا کہ میں پڑھنے لکھنے میں دھیان نہیں دیتی۔ اس وقت تو میرے دل میں اس کے خلاف نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ مگر اب محبت اور لگاؤ کا بین ثبوت تھا۔ آہ امجد، تو کس قدر اچھا ہے۔ مجھے تیری سادگی پسند ہے۔ اب میں جان گئی ہوں کہ جھوٹی نمائش اور تکلف کتنی بری خصلتیں ہیں۔ آہ تیرا ہر بات پر مسکرانا اور پھر مسکرا کر ایک دم سے سنجیدہ ہو جانا کس قدر دلکش اور روح پرور ہوتا ہے۔ میں نے کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ سمجھا تھا کہ جو لوگ ایسی عادت رکھتے ہیں وہ دغاباز اور مکار ہوتے ہیں۔ میں تجھے نہ سمجھ سکی مگر اب خوب سمجھ گئی ہوں۔ دنیا میں اگر کوئی میری پسند اور محبت کا حقدار ہو سکتا ہے تو وہ صرف تو ہے۔ میرے امجد۔ میرے ہونے والے شوہر۔ امجد۔ اس کے بعد میں اپنی مستقبلی زندگی کا خواب دیکھنے لگتی..... کس طرح

میں اور امجد ایک دوسرے کے جیون ساتھی ہو جائیں گے۔ کس طرح وہ مجھ سے محبت کی باتیں کیا کرے گا۔ اور میں کن کن طریقوں سے اس پر جان و دل نثار کروں گی ۔ وہ تھک تھکا کر آئے گا تو میں اس کے پیر دابوں گی و جب تک خود بھی نہ ہنس دے۔ مسکراتی رہوں گی ۔ ہنستی رہوں گی ۔ اور پھر ہم دونوں ہنستے رہیں گے۔ چاندنی راتوں میں گھنٹوں باغ میں گلاب، چنبلی موتیا کے سائے تلے ان کی خوشبو سونگیں گے۔ وہ مجھے پھولوں سے مارے گا اور میں اس پر پھولوں کی بارش کر دوں گی ۔

اور پھر ہم اپنی زندگی کے متعلق باتیں کرتے کرتے سو جائیں گے۔ اس کے بعد میرا دماغ کام نہ کرتا۔ میں اپنے بدن میں جھرجھری سی محسوس کرتی۔ آنکھیں بند کئے ہوئے اس خیالی دنیا کا پھر سے تصور باندھتی ۔ اور کسی ایک جگہ چنبلی، موتیا یا گلاب کا سایہ ہوتا۔ اور مجھے نیند لگ جاتی ۔

چند دن اسی طرح گذر گئے۔ امجد کے گھر والے ہمارے گھر مہمان آئے۔ اور ان کے جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ امجد نے رضامندی ظاہر کر دی ہے ۔ اور وہ کچھ اسی کے متعلق بات چیت کرنے آئے تھے ۔ میں نے اپنی ایک سہیلی سے امجد کے بارے میں ہنستے ہوئے کہا۔ " امجد فرشتہ ہے سمجھیں، وہ مجھے بچپن سے پہچانتا ہے۔ میرے دل کو بھی پرکھ لیا ہے۔ مرد کی خوبی تو یہی ہے کہ وہ عورت کے دل کا راز جان لے۔ امجد نے غلطی نہیں کی۔ کیا بتاؤں بہن مجھے امجد سے کتنا انس ہے۔ وہ میرا نہ ہوا تو میں زندہ کیسے رہوں گی ؟ میں سوچتی رہتی ہوں "۔ اس سہیلی نے میرا مذاق اڑایا۔ گویا۔ میری محبت کا۔ امجد کا۔ میرے دل کا۔

سب کا مذاق اڑایا۔ عورتیں ایک دوسرے کو نہیں سمجھ سکتیں۔ مجھے اپنی سہیلی کی حالت پر افسوس ہوا۔ وہ کس قدر تنگ نظر اور بے دل کی لڑکی تھی۔ امجد بہت دنوں سے نہیں آیا تھا۔ آنکھیں اس کو ترس گئیں تھیں۔ دل کو سمجھا لیتی کہ مصروفیت ہوگی اور اگر نہ بھی ہو تو اب تو ہم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے وابستہ کر دئے جائیں گے پھر اس کی کسر نکالوں گی۔ پل بھر کو بھی باہر جانے دیا ہو تو کہنا۔ دو مہینے تک نہ امجد ہی آیا اور نہ اس کے والدین ہی نے اس سلسلہ میں کچھ کہا سنا۔ میں انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔ آخر کو میری دعائیں قبول ہوئیں اور خود والد نے اس معاملہ میں پیش قدمی کی۔ جا کر امجد کے والد سے ملاقات کی۔ ان کا عندیہ لینا چاہا۔ انھوں نے تھوڑے پس و پیش کے بعد کہا "امجد نے ابھی کوئی قطعی رائے نہیں ظاہر کی ہے" والد صاحب نے زور دینا چاہا تو انھوں نے اور ایک ماہ کی مہلت چاہی۔ میں نے جب سنا تو مجھے جیسے کسی نے گڑھے میں ڈھکیل دیا ہو۔ غصہ تو تھا ہی۔ آگا سوچا نہ پیچھا قلم دوات لے۔ امجد کو ایک خط لکھ دیا۔ دو چار سطروں میں تو نہایت سخت الفاظ لکھے۔ بالکل امجد بھائی کے لئے لیکن جب ایک مہینے کے بعد کا خیال آیا۔ میں دلہن بنی بیٹھوں گی۔ لوگ کہیں گے امجد کی دلہن، میرے قلم نے کچھ کا کچھ لکھ دیا۔ آہ میں نے ایسا کیوں لکھا۔ ایسا دھوکہ کیوں کھایا گر جو ہونا تھا سو ہوا۔

امجد۔ دغاباز، بے وفا امجد۔ اس نے میری کوئی پرواہ نہ کی۔ میں اس کے ساتھ ایک زمانے تک کھیلتی رہی۔ میں اس کی رشتہ دار۔ اس نے مجھے دھوکہ دیا.....

میرے آنسوؤں کو بناوٹی اور معمولی سمجھا۔ میں نے اس کے اطمینان کے لئے اپنی محبت کو قسمیں کھا کھا کر ثابت کرنا چاہا۔ اس نے جو کچھ پوچھا اس کا اثبات میں جواب دیا تھا۔ اس نے پوچھا تھا۔ "میں بھوکا رکھوں گا؟" میں نے جواب دیا "میں بھوکی رہوں گی"۔ "میں ماروں گا" میں نے جواب دیا "منظور ہے" اس نے کہا۔ "تم کو میرے لئے جان دینی ہوگی۔ میں کہوں گا مرجاؤ۔ تو" میں نے اس پر بھی کہا تھا "میں مرجاؤں گی۔ میں تمہاری رہوں گی۔ مگر تم مجھے دھوکہ نہ دو۔ مجھے اپنی بیوی بنالو۔ مجھ سے شادی کرلو"

میں جانتی تھی کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔ لیکن حقیقت ہوتی بھی تو میں اس کے لئے دل و جان سے تیار تھی۔ اس نے اس کے باوجود مجھے دھوکہ دیا۔ صرف میری غربت کی وجہ سے۔ میرے ماں باپ غریب تھے۔ وہ چاہتا تھا دولت۔ وہ چاہتا تھا اثر و اقتدار ایسا خسر جو اسے بیٹی بھی دے اور نوکری بھی دلائے۔ کم بخت امجد، بیوی کے مال کے لئے اپنے آپ کو بیچنے والا امجد۔ میں اس کی بیوی ہو جاتی تو اس کے ذرے سے بھی دکھ کے لئے رات رات بھر روتی۔ اس کے پیر دابتی اس کا سر دابتی۔ میں اس کے لئے اپنی جان تک نچھاور کر دیتی۔ مگر اس کی آنکھوں پر تو حرص و تعلیم نے پردہ ڈال رکھا تھا وہ بیوی کا غلام بن کر رہنا پسند کرتا ہے، بھلا مال و متاع لانے والی بیوی اس کو کیوں خاطر میں لائے گی؟ زیادہ کچھ گڑبڑ کی تو اس کا الگ راستہ اور ان کا الگ۔ اس پر وہ تھوکے گی بھی نہ۔ یہ بیمار ہو جائے اور ایڑیاں رگڑے تو اس کی بلا کو غرض ہے کہ اس کی تیمارداری کرے۔ ارے کیا یہ ہمیشہ ایسا ہی تندرست رہے گا۔

ہمیشہ اس کی یہی حالت رہے گی۔ کیا وہ ہمیشہ دل دکھاتا ہی رہے گا۔ اس کا بھی دل دکھے گا۔ اور میں بھی دیکھوں گی۔ دل دکھانے والے کا دل کیسے دکھتا ہے آہ امجد تو نے ایک امیر لڑکی سے شادی کرلی۔ صرف اس کے مال و متاع پر تو نے اپنی نیت ڈاواں ڈول کردی۔ میری زندگی زیروزبر کردی۔ تو نے صرف مال و دولت کو دیکھا تو نے کبھی اندرونی حالت پر بھی غور کیا؟ اس لڑکی کا دل کیسا ہے، دماغ کیسا ہے؟ تو نے اسے کبھی دیکھا بھی۔ میں تو تیرے ساتھ کھیلی۔ تجھ سے لڑی، تجھ سے اپنا سبق پوچھا۔ تو میری طبیعت سے واقف اور میں تیری طبیعت سے۔ پھر تو نے مجھے کیوں ٹھکرا دیا؟ میں نے تجھے خط لکھا۔ کیا اس لئے؟ میں نے تجھے منہ پھوڑ کر اپنا شوہر بننے کو کہا؟ کیا اس لئے؟ میں نے تجھے دھوکا دینا نہیں چاہا۔ میں نے اپنے دل کی بات تجھ سے کہہ دی۔ کیا اس لئے — ؟ تجھے شاید یہہ یقین ہو کہ تیری شادی ہو جانے کے بعد بھی میں تیری مالا جپتی رہوں گی اب بھی تیرے اشارے پر چلوں گی۔ تجھ سے اسی طرح کھل کر باتیں کروں گی تجھے اب بھی اپنا سمجھوں گی۔ کیونکہ میں نے اقرار محبت کرلیا ہے۔ یہہ تیری بھول ہے؟ مردوں کی یہی بھول مجھے غصہ دلاتی ہے۔ سمجھتے ہیں کہ جس عورت نے بھی ان کی طرف نظر انتخاب ڈالی اور بس عمر بھر کے لئے بندۂ بے دام ہوگئی۔ ہاں صرف ایک ہی صورت میں ایسا ہو سکتا ہے۔ وہ یہہ کہ وہ بھی صرف اس کا ہو جائے ورنہ؟ کیا سمجھتے ہو تمہارا دل تو اس قدر سخت ہو جائے کہ ایک کو دہوکہ دے کر دوسرے کو اپنا شریک زندگی بنالو اور ہم صرف تمہیں پھولتا پھلتا دیکھتے ہوئے ہی اپنی زندگی گزار دیں۔ میں بھی شادی کروں گی۔ تیرا خیال تک نہ کروں گی تو جس کے ساتھ بھی رہ ذلیل و خوار رہ۔ اور میں جسکے ساتھ بھی رہونگی خوش رہونگی مجھے اب یہہ راز معلوم ہوگیا ہے "محبت شادی سے پہلے نہیں بلکہ شادی کے بعد کیجاتی ہے اور صرف خاوند سے۔"

ہم سفر

تعطیلات ویسے بھی جلد گزرتے ہیں، جیسے پر لگ گئے ہوں گاؤں پہنچ کر ہاتھ پاؤں بھی سیدھے نہ کرنے پایا تھا کہ آٹھ دن گذر گئے اور آنکھ جھپکانے ہی میں (مجھے تو کچھ ایسا ہی معلوم ہوا) بیس دن گزر گئے۔ دلچسپیوں کا یہ عالم تھا کہ بس امڈی پڑتی تھیں۔ آج شکار پارٹی ہے تو کل جلسۂ موسیقی، کہیں دعوت ہے تو کہیں ڈرامہ، ہر وقت دوست احباب کے جھرمٹ میں گھرا رہتا ہنسی دل لگی رہتی۔ دھول دھپا رہتا اور اسی طرح تعطیلات ختم ہونے کو آ گئے واپسی کی ٹھیری۔ والدین کی جلدی نے دو چار دن ٹھیرنے کی بھی مہلت نہ دی سمجھتے ہوں گے کہ دو چار دن پہلے چلا جاؤں گا تو واپسی میں شاید کچھ دن پہلے اجازت مل جائے۔ مجبوری تھی۔ سارے دوست احباب اسٹیشن پہنچانے اور خدا حافظ کہنے آئے تھے ان لوگوں کے جھرمٹ سے دور میری نظریں چند اور چیزوں کو بھی دیکھ رہی تھیں۔ ہرے ہرے کھیت، گہری گہری باولیاں، گھنے جنگل، وحشی پرند سب مجھے حسرت سے تکتے دکھائی دئے میں نے سب پر الوداعی نظر ڈالی۔ اور اپنا سر کھڑکی کے اندر کر لیا سوچا کہ اب چاہے گاڑی قیامت تک یہیں کھڑی رہے میں تو جھانکنے والا نہیں ہوں۔ ڈبہ میں میرے اور ایک دو مسافروں کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ اور میرے نزدیک دوسرے مسافروں کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی لیکن گاڑی اب چھوٹنے کو ہوی تھی کہ گاؤں والوں کا ایک قافلے کا قافلہ ڈبے میں گھس پڑا کسی کے ہاتھ میں ڈوئی ہے تو کسی کے ہاتھ میں چھاج۔ کوئی بچہ چمکار رہا ہے تو

کوئی تمبا کو گھول رہا ہے۔ ایک عجیب سی ہڑ بونگ مچ گئی۔ مارے چیخوں کے کان کے پردے پھٹے جارہے تھے "ارے بچے کو ادھر دے" میں تو بوکھلا گیا۔ ڈانٹ کر کہا "جاؤ۔ اے جاؤ، دوسرے ڈبے میں" وہ کہنے لگے "دوسرے اسٹیشن پر ہی اتر جائیں گے صاب" مجھے بہت غصہ آیا لیکن چپ ہو رہا۔ "اسٹیشن کا تو سوال ہے" سمجھا اور ان میں سے ہر ایک کو غور سے دیکھنے لگا۔ اتنے میں ایک بے تکلف ہم سفر نے میرے بستر پر بیٹھنے کی "سعیٔ بلیغ" کی بھرا تو بیٹھا ہی تھا۔ اپنے پاؤں پھیلا دئے۔ وہ کسمسا کر اٹھے اور چپ چاپ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگے ان کی اس "خاموشی" نے میرے دل پر بہت اثر کیا اور میں نے از راہِ عنایت اپنا بستر کھینچ لیا۔

سفر کئی طرح دلچسپ ہو سکتا ہے۔ یا تو کوئی "اچھا" ہم سفر ہو، یا پھر کوئی دلچسپ ناول ہی اس کمی کو پورا کر سکتا ہے۔ اپنے ماحول سے بے خبر اور بے نیاز ہو کر اس خاموش ہم سفر کی باتیں سنئے۔ راستہ بڑے مزے سے کٹ جاتا ہے۔ میرے ساتھ ایک ناول "گہری چال" تھا لیکن اپنے ہم سفروں کے بارے میں بڑا بد قسمت ثابت ہوا۔ کوئی بھی ایسا نہ تھا جس سے بات چیت کرنا، دوسرے گھر سے بورڈنگ جاتے ہوئے کوئی بھی اس اقدام پر مائل نہیں ہوتا۔ گاڑی اپنی رفتار پر آ گئی تو میں نے اپنا ناول نکالا اور پڑھنا شروع کیا پڑھنے سے طبیعت اکتا جاتی تو کوئی شعر گنگنانے لگ جاتا چند اسٹیشن گزر گئے لیکن یہہ بات باعث اطمینان تھی کہ برآمد کی بہ نسبت درآمد کم ہے۔ آگے کے اسٹیشن پر ایک صاحب، صورت و لباس سے تعلیم یافتہ معلوم ہونے والے، ڈبے میں گھسنے کے لئے لپکے۔

میں نے صورت بنالی۔ مخلصانہ انداز میں کہا "جگہ نہیں ہے، کھڑا رہوں گا" جواب دیا گیا "جی" کہہ کر خون کے گھونٹ پیتا میں پھر سے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ اب ان نو وارد صاحب کی شرارت تو ملاحظہ کیجیے کہ کھڑے کھڑے ناول سے شوق فرما رہے ہیں میں نے کنکھیوں سے ان کے اس قابلِ گرفت فعل کو دیکھا اور انجان بن گیا تھوڑی دیر بعد جب میں ورق پلٹنے کو ہوا تو کہنے لگے "جی ذرا۔ معافی چاہتا ہوں میں ایک دو سطریں اور۔ شکریہ" میں نے کتاب بند کر کے ان کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ بھلا وہ شخص جس نے ہمارا کہنا نہ مانا ڈبے میں در آیا اس کا کیا لحاظ۔ کچھ جھجکے۔ پھر کتاب ہاتھ میں لے لی اور اسے میرے صندوق پر رکھ دیا۔ وہ برابر دو اسٹیشن کھڑے رہے کوئی بات کرنے والا نہ کوئی ہمدرد عجیب عالم بیکسی تھا۔ کھڑے کھڑے پاؤں سن ہو گئے تھے اور آخر کسی نہ کسی طرح سامنے کی سیٹ پر جگہ نکال ہی لی۔ میں ان کی طرف بالکل متوجہ نہ تھا کھنکار کر مجھے متوجہ کرنا چاہا مگر میں انجان بنا رہا۔ نہایت ہی ملائم لہجہ میں دریافت کیا گیا "کہاں سے تشریف آوری ہو رہی ہے۔" میں نے سنی ان سنی کر دی کچھ سٹ پٹائے، میرے گھٹنے کو جھنجوڑتے ہوئے کہنے لگے۔ "مجھے آگے کے اسٹیشن پر پانی مل سکے گا" میں نے بیزاری ظاہر کرتے ہوئے کہا "معافی چاہتا ہوں مجھے آپ دق نہ کریں۔ میں کچھ پریشان سا ہوں" ان کے لئے یہ جتانا کہ میں پریشان ہوں گویا کھلا دعوت نامہ تھا نہایت ہی ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا "آخر میں بھی تو سنوں! کیوں کوئی خاص بات تو نہیں۔" "جی نہیں" میں نے ٹالتے ہوئے کہا مگر مجھے محسوس ہوا کہ واقعی میں پریشان سا ہوں اور اگر پہلے نہ بھی تھا تو اب ہو گیا ہوں۔ انھوں نے بڑھ کر کچھ کہنے کا ارادہ کیا

مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئے سارے ڈبے میں ہُو کا عالم تھا۔ تقریباً تمام مسافر ایک ایک کر کے اتر چکے تھے۔ خاموشی ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی انھوں نے کھڑے ہو کر اپنے صندوق میں سے ایک کتاب نکال لی اور ورق گردانی کرنے لگے تھوڑی دیر بعد ایک آہ کے ساتھ کتاب بند کر دی مجھے بھی دل لگی سوجھی۔ میں نے انھیں مخاطب کیا۔ تنہا سفر میں یہ ہم سفر ہی کچھ غنیمت معلوم ہوا "آپ بھی کچھ پریشان سے معلوم ہوتے ہیں" "کچھ نہ پوچھئے انھوں نے کتاب کے اوراق الٹتے ہوئے جواب دیا "آخر کچھ تو" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا کہنے لگے "جناب جس کا رنج اسی کو آپ کو بجائے ہمدردی کے ہنسی آئے گی" میں نے پختہ وعدہ کیا کہ سخت ہمدردی ظاہر کروں گا تھوڑی دیر مجھے گھور کر دیکھا اور نظر چار ہوتے ہی مسکرا کر کہنے لگے "میں بڑا بدنصیب ہوں بچپن ہی سے محبت کے نام سے بھاگنے والا۔ دنیا کو دارالمحن سمجھتا جہاں انسان صرف رونے دھونے کے لئے آتا ہے" اس کے بعد انھوں نے اپنی ایک رشتہ کی بہن سے ملاقات کے واقعات اور پھر پروفیسر صاحب کی بیوی سے محبت کا واقعہ اس درد انگیز اور دلچسپ پیرائے میں بیان کیا کہ میں ہمہ تن گوش بن گیا "ہوں"، "ہوں" کی آوازیں تیزی سے نکلنے لگیں۔ اور آخر میں میں نے ایک آہ کے ساتھ ہمدردانہ لہجہ میں کہا "آپ واقعیٔ قابل رحم ہیں، آپ کی زندگی میں عجیب عجیب واقعات رونما ہوئے۔ آپ ہی کا دل و جگر ہے جو سہہ گئے ورنہ مجھ جیسا ہوتا تو مر ہی جاتا" اس کے بعد میں نے توشہ نکالا اور اصرار کے ساتھ انھیں بھی شریک کر لیا میری نظروں میں ان کی عزت کئی گونہ بڑھ گئی تھی۔ ان کے ساتھ ہمدردی اور ان کا دل بہلانا میرا اولین فرض بن گیا۔ میں نے کئی غزلیں گا کر سنائیں دلچسپ موضوع چھیڑے

بہت کھل کر بات چیت کی پوری دلچسپی سے اُن کی باتیں سنیں۔ اپنے گزشتہ برتاؤ کی معافی چاہی، ان کا اسٹیشن قریب آرہا تھا، انھوں نے اپنا سامان درست کیا اور جب گاڑی کی رفتار دھیمی ہونے لگی تو میرا سفری ناول بطور یادگار مانگا میں نے بخوشی پیش کر دیا جس پر انھوں نے بھی اپنی کتاب "خواب وخیال اور دیگر افسانے" مجھے تحفتہً دی کہ میں بقیہ فاصلہ اسے پڑھ کر کاٹوں۔ گاڑی چلنے لگی وہ اتر چکے تھے۔ مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا اور خدا حافظ کہا، بہت دور تک ان کی مسکراتی ہوئی شکل آنکھوں میں پھرتی رہی۔

پہلا ہی افسانہ خواب وخیال، جوں جوں پڑھتا جاتا تھا حیرت بڑھتی جاتی تھی اور پھر غصہ بھی آنے لگا دانت پیستے ہوئے میں نے کتاب بند کر دی جی تو چاہتا کہ کتاب کے پرزے پرزے اڑا دوں مگر ضبط کیا "جھوٹا، مکار، دغاباز، فریبی، کتا، گدھا" نہ جانے کیا کیا اس عیار ہم سفر کی شان میں کہہ گیا۔ اس کی داستان کا سارا پلاٹ اسی قصہ کا تھا بیہودے نے کتنا دھوکہ دیا، اسی پیچ وتاب میں بیٹھا تھا۔ اپنی سادہ لوحی پر خود کو کوستا اور اس ناہنجار کو بددعائیں دیتا رہا جس نے میری توجہ سے اس بری طرح فائدہ اٹھایا اپنے سر کو کھڑکی سے باہر نکالا یونیورسٹی کی سربفلک عمارت نظر آرہی تھی۔ خوشی کی ایک لہر سارے جسم میں دوڑ گئی اور میں سب کچھ بھول چکا تھا۔
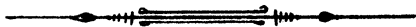
واٹر پروف

چھتری سے ہمیں کچھ زیادہ شکایت نہ تھی۔ لیکن کل بازار سے گھر آتے وقت،

حاجی دادا کی دکان پر لٹکے ہوئے واٹر پروف کو دیکھ کر تو منہ میں پانی ہی بھر آیا۔ آہ وہ

واٹر پروف۔ کس قدر دبیز، پھر سلوائی کتنی پاکیزہ۔ کمربند کس قدر خوبصورت۔ استر۔ اس کا

اور میرا پیارا استر۔ سہ رنگی خانے ان خانوں کے اطراف سہ رنگی کاڑیاں۔ محسوس ہونے

لگا کہ چھتری کا سایہ جو اب تک اپنے سر پر رہا وہ محض ہماری بے وقوفی کی وجہ سے تھا۔

کس قدر تکلیف دہ۔ ایک ہاتھ اس کے لئے ہمیشہ محفوظ کردو۔ اور پھر سیاہ رنگ منحوس

بھی ہوتا ہے۔ اور یہہ سر سے پیر تک کالی۔ جب کبھی یہہ بلا ساتھ رہی۔ کسی نہ کسی راہ گیر

کی ڈانٹ سنی ارے خواہ مخواہ لوگوں کی آنکھوں میں اپنی ٹانگیں اڑاتی ہے۔ کسی نے

جو یہہ کہا ہے کہ کالا رنگ نظر توڑ ہوتا ہے تو شاید چھتری کو دیکھ کر ہی کہا ہو۔ لعنت ہے

چھتری پر۔ اور جس وقت اس واٹر پروف کے نیچے سے گزرا ہوں تو ہوا کے ایک جھونکے

سے وہ میرے چہرہ سے ٹکرا گیا، کیا بتاؤں کہ کس عالم سرور میں اس کو بازو ہٹایا ہوں

اس لمس سے سارے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی۔ ایک بار نہایت ملائمت سے اس پر

ہاتھ پھیرا اور چلا آیا۔ چلتے چلتے مجھے محسوس ہوا کہ میں وہی واٹر پروف پہنا ہوا ہوں

بارش ہو رہی ہے۔ لیکن واٹر پروف کے مقابلے میں آسمان بھی پھٹ پڑے تو کیا ڈر۔

جسم تک ایک قطرہ بھی نہ آسکا اور میں نہایت اطمینان سے قدم اٹھاتا چلا جا رہا ہوں

واٹر پروف کی جیبوں میں میرے ہاتھ ہیں اور میں پانی کی ان دھاروں کو دیکھ رہا ہوں جو میرے واٹر پروف پر سے پھسل پھسل کر زمین پر گر رہی ہیں۔

گھر میں داخل ہوا تو سامنے ہی کھونٹی پر چھتری لٹک رہی تھی۔ وہی روسیاہ۔ دانت پیستا ہوا اس کی طرف بڑھا اور اسے ہاتھ میں لے کر زور سے صحن میں پھینک دیا بیگم اپنے کمرے سے نکلیں میں سمجھتا تھا کہ وہ میرے واٹر پروف کو دیکھ کر مجھ پر ایک چھوڑ ہزار جان سے عاشق ہو جائیں گی۔ مگر انھوں نے چیخنا شروع کیا۔ "اے یہہ کیا دیوانگی ہے کہیں نشہ میں تو نہیں ہو۔ دیکھو تو کیا حال بنا رکھا ہے۔ پانی میں تر اور ہوئے جا رہے ہو"

ہم نے پہلے انھیں غور سے دیکھا۔ پھر اپنے پر نظر ڈالی۔ ہائے میرا واٹر پروف! بیگم کی چیخوں نے اسے ناراض کر دیا۔ وہ پرواز کر گیا۔ میرے جسم کو چھوڑ کر چلا گیا۔ میری شیروانی۔ میرا قمیص پاجامہ۔ اس کے لئے اشک باری کر رہے تھے۔ جہاں کھڑا ہوا تھا اس جگہ کیچڑ بن گیا تھا۔ بیگم نے پھر چیخا "میں پوچھتی ہوں۔ آخر یہہ چھتری ہے کس مصرف کی" اور اسے کھونٹی پر نہ پا کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ صحن میں کیچڑ میں لت پت ذبح شدہ مرغی کی طرح پر و بال کھولے پڑی تھی۔ میں سوچتا ہوا کھڑا رہا۔ اتنے میں بیگم نے دوسرے کپڑے لے آئے۔ میں نے اپنے بھیگے ہوئے کپڑے اتار دئے۔ لاحول ولا قوۃ۔ واٹر پروف کے خیال نے کتنا دھوکہ دیا۔ کس مزے سے بھیگتے ہوئے آئے کہ اپنے پر سے قربان جانے کو جی چاہا، چائے پی کر ہم نے واٹر پروف کے بارے میں بیگم سے بات چیت شروع کر دی:۔

"تم مجھے بیمار ڈال دو گی"

"میں کس طرح"

"اس طرح کہ ایک واٹر پروف کے لئے کوئی منہ نہیں نکال رہی ہو"

"گویا چھتری بالکل بیکار ہے"

"دیکھو! اب کی دفعہ پھر تم نے اس منحوس چھتری کا نام لیا تو آگ ہی لگا دوں گا اسے"

"خوب! کس کے مال کو آگ لگائی جا رہی ہے۔ دیکھوں نا کیسی آگ لگاتے ہیں؟"

اب میں کیا کرتا جب وہ لڑائی پر اس طرح تلی ہوئی تھیں تو مصلحت اسی میں تھی کہ خاموش ہو جاؤں، ایک بے سمجھ سے کہاں تک تو تو میں میں کرتا۔ "تو پھر تم سے کہنا ہی بیکار ہے۔ جس کے دل میں ذری سی بھی ہمدردی نہ ہو اس کے سامنے اپنا دکھڑا رونے سے کیا حاصل" ہماری آنکھیں واقعی پُر نم ہو گئیں۔ انھوں نے مجھے نظر بھر کر دیکھا اور چپ ہو رہیں۔ دوسرے دن جب ہم کچہری جانے لگے۔ تو "لو یہ پانچ روپے ہیں جو جی میں آئے سو کرو" ہماری اس وقت اگر کوئی تصویر لیتا تو ہم بالکل کھلے ہوئے کنول معلوم ہوتے۔ انھیں دعائیں دیتے ہوئے۔ سیدھے حاجی دادا کے ہاں پہنچے۔ اور جا کر اسی واٹر پروف کو نکلوایا پہننے پر معلوم ہوا کہ نہ صرف میں بلکہ بیگم اور اس کے ساتھ ان کا پاندان بھی مزے سے سما سکتے ہیں، دکاندار نے دوسرے واٹر پروف بتائے مگر "محبت ایک سے کی جاتی ہے اور صرف ایک دفعہ" ہمارے کانوں میں گونج رہا تھا۔ وہی واٹر پروف خرید لیا۔ اور دعائیں کرتا کہ خدا فوراً حضرت میکائل کو برسات کا حکم دے دے۔ دوسرے جگہ کہیں نہ سہی کم از کم مجھ پر ہی برسات ہونے لگے۔ اور واٹر پروف کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع مل جائے

مگر توبہ کیجئے ایسی تیز دھوپ پڑی ہے کہ واٹر پروف وبال دوش ہوگیا اس دن سے پہلے قدرت کے خلاف میں دبی زبان ہی میں کہا کرتا تھا لیکن اس دن علی الاعلان کہہ اٹھا کہ قدرت ظالم ہے، بے رحم ہے کسی کے جذبات کی اسے پرواہ نہیں۔ پانی نہ برسا کر اس نے میری کتنی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس کا اسے کچھ احساس ہے کچھ نہیں وہ کسی کا کچھ خیال نہیں کرتی۔ اسی پیچ وتاب میں گھر آیا۔ بیگم نے واٹر پروف پسند تو کیا۔ لیکن جب اسے اس قدر ڈھیلا دیکھا تو ناک بھوں چڑھا لیں۔ میں نے معاملہ رفع دفع کرتے ہوئے کہا۔" ہمارا بڑھتا جسم ہے۔ پھر پانی پڑنے سے یہ کچھ سکڑے گا بھی۔ چند دنوں میں برابر ہو جائے گا" واٹر پروف نے چھتری کی جگہ لے لی۔ کبھی اس ہاتھ پر ہے تو کبھی اس ہاتھ پر۔ کبھی اس کاندھے پر ہے تو کبھی اس کاندھے پر۔ غرض یہ کہ اٹھتے بیٹھتے ہمیشہ ساتھ اور نظر کے سامنے رہتا

ایک ہفتہ بھر صبر کیا۔ لیکن بارش آج ہوتی ہے نہ کل، گھٹا جھوم جھوم کر آتی۔ اور ایک بوند بھی برسائے بغیر کھل جاتی یقین ہونے لگا کہ بارش محض ہمیں بھگانے کو ہوتی ہے اور اب چونکہ ہم نے اس کے مقابلہ کی کافی تیاری کر لی ہے برستی ہی نہیں۔ ایک دن یہی جی میں آئی ذرا باغ چلیں اور واٹر پروف لے کے گھر سے نکلے۔ آسمان پر بجلی چمک رہی تھی کچھ کچھ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اور ہوا کی خنکی سے معلوم ہوا کہ کسی دوسری جگہ بارش ہو رہی ہے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آبادی سے دور ہو گئے۔ اور پھر ایک پہاڑ کے دامن میں تفریح کرنے لگے کہ اتنے میں آندھی کا ایک زبردست جھونکا۔ اور پھر موسلا دھار بارش ہم نے واٹر پروف اوڑھ لیا۔ اور تانیں کھینچتے ہوئے بارش کے منظر سے لطف اندوز ہونے لگے

پانچ منٹ ہوگئے بارش کے تھمنے کے آثار ہی نہ تھے۔ پندرہ منٹ ہو گئے۔ اس قیامت کی بارش ہو رہی تھی کہ قطروں کے زمین پر پڑنے سے دھواں سا اٹھنے لگتا۔ ہمارے چہرے پر بچھاڑ سے سختی اور خنکی پیدا ہو گئی، دانت بجنے لگے پانی، کالر کی راہ بہہ بہہ کر شیروانی کے اندر داخل ہونا شروع کیا ہم نے اب خیر اسی میں دیکھی کہ گھر لوٹ چلیں، زیادہ بھیگنا فضول اور مضر صحت ہوگا راستہ میں چھوٹے چھوٹے نالے بہہ نکلے تھے۔ ہم ان میں سے چلتے نہایت اطمینان سے آرہے تھے کہ ناگہاں۔ ایک گڑھے میں ہمارا پیر اتر گیا۔ کیچڑ میں لت پت ہوگئے واٹر پروف بھی لتھڑ گیا۔ بہزار خرابی اپنے پیر کو اس گڑھے میں سے نکالا۔ اور بازو بازو سے بچتے بچاتے چلنے لگے۔ بارش کچھ دیر بعد تھمی لیکن پھر اسی زور وشور سے ہونے لگی۔ سامنے کسی کے باغ کا کمپونڈ تھا۔ اور اس میں ایک جھاڑ پھونس کی جھونپڑی دکھائی دی ہم نے سر چھپانے کے لئے یہی آسرا غنیمت سمجھا۔ اور اندر گھس آئے۔ جھونپڑی میں سوراخ تو بہت سے تھے لیکن ایک آدمی بارش سے اچھی طرح محفوظ رہ سکتا تھا۔ میں نے واٹر پروف اتار کر درخت کی ایک شاخ سے لٹکا دیا۔ اور قطروں کے متواتر گرنے کو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھتا رہا۔ کہ اتنے میں ایک بڈھا مالی اس طرف کو آنکلا۔ مجھے دیکھ کر نہایت متعجب ہوا ڈانٹ کے انداز میں کہنے لگا۔ "کون ہو"۔ ہم نے اطمینان سے جواب دیا "ہم ہیں"۔ "یہاں کیوں بیٹھے ہو؟" اس نے پوچھا "باہر بھیگ رہے تھے۔ دو چار دن سے بخار آرہا تھا۔ اس لئے یہاں آکر آسرا لیا"۔ "ارے بھلے آدمی" اس نے میری ہیئت کذائی کو دیکھ کر ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔ "یہ تو نواب ... کا باغ ہے

اُن کا زمانہ آکر اترا ہے۔ خبر ہوگئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ چلو بھاگو!—"
میں نے دل میں سوچا۔ نواب صاحب کم از کم بی، اے ہوں گے۔ امیر آدمی ہیں اخلاق و شرافت کے پتلے ہوں گے۔ اگر بفرض محال مجھے دیکھ بھی لیا تو نہایت اخلاق سے اندر لے جائیں گے۔ کپڑے بدلوائیں گے۔ چائے پلائیں گے۔ اور یہہ سوچ کر ہم نے اس بڈھے سے کہہ دیا۔ "پانی کے تھمنے تک تو ہم باہر نہیں نکلتے" وہ بڈھا اس جواب کو سن کر چلا گیا۔ بارش قدرے کم ہو رہی تھی۔ کئی آدمیوں کے بھاگتے ہوئے آنے کی آواز آئی۔ اور کسی نے للکار کر کہا۔ "لینا۔ لینا۔ پکڑو، جانے نہ پائے۔ کوئی چور گھس آیا ہے۔" میں نے اس غل کو سنا تو کہاں کا واٹر پروف اور کیسی جھونپڑی سر پہ پاؤں رکھ کر جو بھاگا ہوں بھیگتا ہوا تو گھر آکر ہی دم لیا۔ بیگم نے اس حالت میں دیکھا تو واقعی ان کی حالت قابل رحم ہوگئی۔ میں نے ہانپتے ہوئے کہا—
"واٹر پروف واپس کر دیا۔ بس پڑ گئیں تمھیں پیچھے کہ ڈھیلا ہے۔ ڈھیلا ہے۔ چلو واپس کر دیا۔ واٹر پروف۔ واٹر پروف، وہ واپس ہوگیا۔" میں نے پلنگ پر لیٹتے ہوئے ایک لمبی سانس لی۔

جھٹکہ والا

جھٹکہ والے کو ذرا " استاد" کہہ دیجئے یا کرایہ میں زیادہ تکرار نہ کیجئے تو نہایت شرافت اور انسانیت کا برتاؤ کرتا ہے۔ یہہ معلوم ہوگا کہ جھٹکہ ہمارا ذاتی ہے اور جھٹکہ والا بھی ہمارا نوکر ہے۔ آپ کے ہاتھ میں سامان ہوگا تو یہہ جھپٹ کر اسے لے لیگا۔ قرینہ سے جھٹکہ میں جما دے گا اور پھر آپ جب سوار ہونے کو ہوں گے تو بڑھ کر دروازہ کھول دے گا اور آپ سوار ہولیں تو اسے بند کرتا ہوا آپ سے پوچھے گا " کدھر سے چلوں میاں" اس کا یہہ پوچھنا اس کی عین خوشنودی کی دلیل ہے۔ آپ چاہیں ڈیڑھ دو میل کا چکر دے کر بھی لے جائیں۔ یہہ برا نہ مانے گا۔ گھوڑے کو " چل بیٹا چل" کہتے ہوئے یہہ آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ " تو میاں آپ کچہری میں ہیں نا" آپ کسی کچہری میں نہ بھی ہوں تو اس کی دل شکنی کے خیال سے آپ کہہ دیں گے "ہاں۔ ہوں" کیونکہ وہ اس وثوق اور ارمان سے یہہ سوال کرتا ہے کہ سننے والے کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ اگر جواب نفی میں دیا گیا۔ تو وہ گنگ ہو جائے گا پھر کبھی بات نہ کرے گا "کونسی کچہری"؟ وہ پوچھتا ہے لیکن ساتھ ہی یقین بھی ہوتا ہے کہ آپ کا تعلق ضرور " صفائی" سے ہوگا اور جواب کا انتظار کئے بغیر۔۔ " اے ہٹ جاؤ موڑ سے" کا نعرہ لگا کر "کیا اندھیر ہے میاں۔ کل تمام دن کچہری کے دروازہ پر سڑتے پڑے رہے۔ اس منشی کے ہاتھ جوڑے۔ اس کے پاؤں پڑے بغیر پیسے کے مانیں گے ہی نہیں بولتے ہیں۔ کیا مصیبت ہے عجب عجب باریکیاں نکال رہے ہیں۔

گھوڑا موٹا تازہ ہوتا۔ تو دیتے کیوں نہیں دانے کے پیسے۔ گھاس مفت دلاؤ۔ گھوڑا بھی موٹا ہوتا ہے۔ ہم بھی خوش رہتے ہیں۔ گھوڑے کو مارو مت۔ بغیر مار کے یہہ ٹٹو چلتے ہیں۔ ہمارے دادا کے پاس ایک عربی گھوڑی تھی جھٹکہ تو بس اس کی پیٹھ پر اڑے رہتا تھا۔ اب دیکھئے اس گھوڑے کو۔ آپ کا وزن ہے ہی کتنا، مگر کیا ہانپ رہا ہے۔ ایک بات ہے۔ نئے نئے قانون نکل رہے ہیں۔ جھٹکہ کو رنگو رے، نمبر لیو رے۔ یہہ کرو رے وہ کرو رے۔ پھر یہہ پولیس والوں کے ہاتھ بڑے برے ہیں۔ ہاتھ اٹھا دیا تو کھڑے رہو پیٹتے ہوئے۔ میاں، بارہ سال سے جھٹکہ چلاتا ہوں ایسا کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اور یہہ پولیس والوں کو دیڑ دمڑی کا ڈریس کیا مل جاتا ہے۔ گویا کوتوالی مل جاتی ہے۔ کسی کی عزت کا تو خیال ہی نہیں۔ سواری اندر بیٹھی ہوتی ہے، مگر دے رہا ہے گالیاں۔ موقع دیکھ رہا ہوں۔ کسی نہ کسی کی کم بختی آئی ہے۔ "اے ہٹ جاؤ موڑ سے" آپ اس معلومات آفریں لہجہ کے دوران میں گردن ہلاتے رہتے ہیں یا "ہوں، ہاں" کرتے رہتے ہیں۔ اپنی قابلیت کا مزید ثبوت دینے کے لئے وہ ایک دوسرا موضوع چھیڑ دیتا ہے۔ "یہہ ہندو مسلم فساد کا کیا ہوا کچھ معلوم ہے میاں" آپ سمجھ جاتے ہیں کہ اس کے پاس اس کا کافی مواد ہے اور اس کو کہنے کا موقع دینے کے لئے آپ تعجب سے پوچھتے ہیں "ہاں، کیا ہوا" وہ سنبھل کر بیٹھ جاتا ہے۔ پہلے آپ کی اس لاعلمی پر تعجب و ہمدردی ظاہر کرتا ہوا پوچھتا ہے "آپ کو نہیں معلوم" اور پھر شروع ہوتی ہے مکمل روداد فساد۔ "کیا بتاؤں میاں گھٹنے گھٹنے برابر خون بہہ رہا تھا۔ ہمارے محلہ کا نبیر جو ہے وہ تو خون میں نہا لیا تھا۔ کسی سے بولئے مت۔ اصل جڑ تو وہی ہے ــــ

اس کی ایک کلال کی لڑائی ہوئی ۔ میں بولوں گا قصور چھوٹو شیر کا ہی ہے ۔ مفت پلاؤ بولے تو باپ بھی نہیں پلاتا ۔ بس اسی بات پر لڑائی ہوگئی ۔ وہ اپنے آدمی لے آیا ۔ یہ اپنے حمایتوں کو لے گئے ۔ لاٹھیاں چلیں ۔ پولیس آئی ۔ چو طرف لڑائی شروع ہوگئی ۔ گر میاں ایک فائدہ تو ہوا ۔ " آپ پوچھتے ہیں ۔ وہ کیا ؟ " وہ ہنستے ہوئے کہنے لگتا ہے ۔ " میری ایک سنا ۔ سے لڑائی تھی دیکھ لیا نا اسے گلی میں داو نہ فریاد ۔ اور سیٹھ ہری لال سے رہن کی سب چیزیں چھڑا لیا " اور پھر تاسف کے لہجہ میں کہے گا " مگر ایک بات بہت بری ہوی ۔ عثمان پاشاہ کا نام بدنام ہوا سنا ۔ انوں بیچارے کیا کرے ۔ لڑے ہم مرے ہم ۔ بدنام ہوے انوں ۔ ایسا نہیں ہونا تھا ۔ اللہ عثمان پاشا کو عمر دے ۔ کیا پاشا ہے میاں ۔ اچھا اب کدھر موڑوں ؟ " آپ اسے سیدھی یا بائیں طرف مڑنے کو کہیں گے ۔ آپ کا مکان ابھی بہت دور رہتا ہے ۔ اس لئے وہ کہتا رہتا ہے ۔ " میں بھی آپ کے جیسا شریف تھا ۔ برے دوستوں میں پڑ کر خراب ہو گیا ۔ باوا کا مرنا کیا ہوا مصیبت آگئی ۔ میں بھی پڑھتا تھا چہارم میں تھا ۔ ان کے مرنے کے بعد ۔ پڑھنا چھوڑا ۔ گھر چھوڑا ۔ پینا کھانا سیکھا ۔ اب اس حالت میں ہوں ۔ اب بھی نام تو لکھ لیتا ہوں ۔ پرسوں کچہری میں مجھے انگوٹھے کا نشان کرد بولے ۔ میں بولا ' لاؤ دوات قلم ' منشی صاحب مجھے نیچے اوپر دیکھنے لگے ۔ " آپ کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھتا ہے ۔ آپ بھی بناوٹی تعجب سے کہتے ہیں " اچھا " " خدا آپ کو نیکی دے فارسی وارسی بھی پڑھا ہوں " اور ہنستے ہوے " پرسوں ایک میم صاحبہ میرے جھٹکے میں بیٹھ گئے تھے مجھ سے پوچھے " تم کو انگریزی آتی ہے " میں بولا " یس " بہت تعجب کرے

کہنے لگے ۔ اور ذرا پڑھتے تو میری نوکری مل جاتی ۔میاں دھیڑوں کی اولاد پڑھ پڑھ کے کرسیوں پر بیٹھ رہی ہے ۔ہم تو شریف الخاندان ۔ہم کو نوکری نہیں مل سکتی تھی ۔ یہہ میم لوگاں بھی عجب ہوتے ہیں ۔ آدمی ان کے سامنے چھپ نہیں سکتا۔" آپ کا گھر آجاتا ہے آپ اتر کر کرایہ دیتے ہیں ۔ وہ جاتے جاتے پوچھ لیتا ہے "پرسوں فتح میدان چل رہے ہیں نا میاں ۔ سالگراں ہے ۔ ٹھیچ چھے بجے آجاؤں گا۔"

اب آپ کسی وقت سواری کی تلاش میں ہوں ۔کسی تانگہ سے کرایہ ٹھیرا کر اس میں سوار بھی ہو جائیں اور کہیں یہہ جھٹکہ والا آپ کو دیکھ پائے تو جھٹکہ دوڑاتے ہوے آئے گا آپ کو اس تانگہ سے اتار کر اپنے جھٹکہ میں بٹھالے گا ۔"یہہ تو میاں کے گھر کی سواری ہے" کہہ کر تانگہ والے کو چپ کرے گا ۔ اور چل بیٹا ٹخ ٹخ ٹخ ۔

بعض دفعہ آپ جھٹکے والے کو ذرا سختی سے کچھ کہہ دیتے ہیں ۔کرایہ میں زیادہ تکرار کرتے ہیں ۔ اور آپ کے اس طرز عمل سے جس جھٹکہ والے کی تخلیق ہوتی ہے اسی سے پناہ مانگنے کی تاکید آئی ہے ۔آپ کچھ پوچھیں گے تو جواب ہی نہ دے گا ۔یا دے گا بھی تو خاموشی کے ہم معنی ۔"مجھے کیا معلوم" آپ پوچھیں گے فلاں مکان معلوم ہے ؟ وہ صاف اڑا دے گا ۔"مجھے نہیں معلوم" اب آپ کہتے ہیں وہ مسجد ہے ۔ وہ ڈیوڑھی ہے ۔وہ کمان ہے وہ گردن ہلاتا رہے گا ۔"نہیں مجھے معلوم نہیں" کوئی نل بیچ میں آگیا تو یہہ جھٹکہ روک لے گا تو دیا پانی پیئے گا ۔ گھوڑے کو پلائے گا ۔ اور اس کے بعد نہایت آہستہ چلائے گا ۔ آپ تیز چلانے کو کہیں تو جواب دے گا ۔"کیا جنور کو مار ڈالوں ۔بیچارہ ہل کے دو پھیرے کر کر آرہا ہے

اور بھیگے ہوئے دانہ کی بکٹ سامنے سے اٹھا کر آپ کے پیروں میں رکھ دے گا آپ کو مجبوراً دستی ناک سے لگانی پڑتی ہے۔ آپ کسی گلی میں داخل ہونے کو کہیں گے وہ اڑ جائے گا۔ "اس کے اندر جھٹکہ نہیں آسکتا" آپ مجبور ہو کر گھر سے بہت دور اتر جاتے ہیں۔ کرایہ دینے گئے تو لینے سے پہلے دیکھ لے گا کہ کیا دے رہے ہیں اور منہ بناتے ہوئے کہتا ہے۔ "کیا دے رہے ہیں؟" "کس کو دے رہے ہیں؟ آٹھ آنے سے ایک پیسہ کم نہ لوں گا" آپ کچھ سختی سے کہیں گے کہ کرایہ یہ نہیں چکایا گیا تھا تو وہ دلیل پیش کرے گا "کیسے معلوم نہ تھا کہ اتنا دور ہے ورنہ آتا ہی کیوں" آپ کو آٹھ آنے ہی دینے پڑتے ہیں۔ ورنہ دو دو ہاتھ اور گالی گفتار کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے۔ کرایہ لیتے ہوئے وہ آپ کو قائل کرائے گا کہ اس کا یہ رویہ بالکل حق بجانب تھا۔ کیونکہ "بساں جب سے نکلے ہیں۔ کوڑی کی آمدنی نہیں آپ جیسے شوقین بیٹھے بیٹھے۔ یا ہر پھر کر زنانی سواریوں پر جینا ہے۔ آٹھ آنے کیا بہت ہیں رستہ میں ٹھیرتے ہوئے بھی تو آئے۔"

آپ نہ تو جواب دیتے ہیں اور نہ وہ اس کے سننے کے لئے ٹھیرتا ہے آپ پھر کبھی اس کے جھٹکے میں نہیں بیٹھتے۔

شرارت
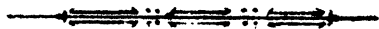
دو لھے میاں برابر دو راتوں سے جاگ رہے تھے۔ آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ ہر ہر حرکت سے بوکھلاہٹ ظاہر ہوتی تھی۔ مرغن سے مرغن غذا موجود تھی مگر اس طرف رغبت ہی نہ ہوتی تھی۔ دوستوں نے جو آگھیرا تو دوستی بھول گئے۔ یہہ دوست بھی عجیب مخلوق ہوتے ہیں۔ موقع کی نزاکت دیکھتے ہیں نہ دوست کی طبیعت۔ جو جی میں آئے کرتے اور کہتے رہتے ہیں فرمائیے یہہ کہنے کا کون موقع تھا کہ "تمہاری شادی ایک گڑیا سے ہو رہی ہے کہاں کی لڑکی، کیسی لڑکی۔" مگر دولھے کے ایک دوست نے یہہ بھی کہا۔ سب قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ دولھے میاں بھی ہنسنے پر مجبور تھے۔ جبریہ ہنسے۔ ورنہ ان کو ہنسانے کیلئے نہ معلوم کون کون سے طریقے استعمال کئے جاتے۔ وہاں سے اٹھے تو کوتوں کوتوں منہ چھپاتے پھرنے لگے۔ سالوں نے دق کرنا شروع کیا۔ ایک سالے کو انھوں نے بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ تھا ذرا زود رنج فوراً اپنے باپ سے جا شکایت کی انھوں نے منہ سے تو کچھ نہ کہا۔ مگر تیور سے خفا معلوم ہوتے تھے۔ دولھے میاں کا سر پھٹنے لگا۔ زنانہ میں جا کر پناہ لینی چاہی تو وہاں سے بڑھا دیئے گئے چار و ناچار دوستوں ہی میں آبیٹھے۔ گانے والی گا رہی تھی۔

اے خیال یار تونے دے دیا دھوکہ مجھے

بار بار یہی مصرعہ گوایا گیا۔ دولھے میاں کی طرف معنی خیز نظریں اٹھ جاتیں

پھر بھی گانے والی نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا تھا۔ دولھے میاں کو کچھ دیر کے لئے چھٹکارا مل گیا۔ شام کے چھ بجے زنانہ سے بلاوا آیا۔ دولھے میاں "جان پر" اندر گئے دیکھا کہ ایک تخت کے اطراف عورتوں کا میلہ سا لگا ہوا ہے۔ اور بیچ میں ایک مورتی سر جھکائے۔ زرق برق کپڑوں میں لپٹی بیٹھی ہے۔ ان کو پکڑ دھکڑ کر اس کے روبرو بٹھایا گیا۔ ایک نے کہا۔" اے ہے۔ دلہن تو یہی معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھو تو پسینے چھوٹ رہے ہیں"۔ دوسری نے جملہ کسا۔" یہہ ان کی پہلی شادی ہے" تیسری نے بلائیں لیتے ہوئے کہا۔" بڑا غریب ہے۔ میری بیٹی بھی بہت غریب ہے"۔ اس جملہ پر تو وہ قہقہے بلند ہوئے کہ دولھے میاں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ کبھی ایک کا منہ تک رہے ہیں تو کبھی دوسری کا۔ دانت پیس پیس کر چپ کرانا چاہتے ہیں اور اس پر بھی جب قہقہے بلند ہوتے ہیں تو مجبوراً مسکراتے ہیں آنکھیں غصہ سے پرنم ہو جاتی ہیں۔

آرسی مصحف کی رسم ادا کی گئی۔ دولھے میاں اس حسین بوجھ کو اٹھائے اپنے کمرہ میں آئے۔ اُسے پلنگ پر تقریباً پٹک دیا۔ سانس پھول رہی تھی۔ پیشانی پسینہ آلود ہوگئی تھی، چپکے سے کمرے کے باہر آگئے۔ اور ایک علحٰدہ کمرہ میں جاکر لیٹ رہے تھکے ہارے تو تھے ہی لیٹنے کی دیر تھی کہ آنکھ لگ گئی۔

دولھے کی ماں سارے گھر میں دھوم مچا رہی تھیں۔" دولھا کہاں ہے؟" کسی کو بھی دولھے میاں کی کمیں گاہ کا علم نہ تھا۔ سبھوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ دولھے کی ماں نے "شاید کہ پلنگ خفتہ باشد" کے خیال سے اس کمرہ میں جو جھانکا تو دولھے میاں کو

محوِ خواب دیکھا جھنجوڑ کر جگایا۔ "آج ہی سونا ہے۔ اور یہاں کیوں سو رہا ہے۔ چل اٹھ"
یہ کچی نیند میں اٹھائے گئے تھے۔ بڑبڑاتے اٹھ بیٹھے۔ ترشروئی سے پوچھا۔ "کہاں جاؤں
کہاں مروں؟" ماں نے تعجب سے پوچھا۔ میں پوچھتی ہوں آخر تجھے ہو کیا گیا ہے۔ صبح سے
دیکھ رہی ہوں۔ چڑ چڑ کر رہا ہے؟" دولھے میاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور خاموشی سے
ماں کے ساتھ ہو لئے۔ ماں نے ان کو دلہن کے کمرہ میں بھیج کر اطمینان کا سانس لیا —
دولھے میاں کمرہ میں داخل ہوئے تو نیند رفو چکر۔ خوشبو کے بھبکے نے دماغ کے کل پرزے
ٹھیک کر دئے۔ کمرے کی ہر چیز چمک رہی تھی۔ اور خصوصاً پلنگ کا بوجھ تو آفتاب بن رہا تھا
رضائی کا رواں رواں چمک رہا تھا۔ دولھے میاں نے آنکھیں صاف کیں گنگنانے لگے

میں ڈھونڈ رہا ہوں مری وہ شمع کہاں ہے

اور لیمپ کی بتی کم ہونے لگی …… شمع کہاں ہے ؟ تھوڑی دیر بعد لیمپ کی روشنی
بہت تیز کر دی گئی۔ دولھے میاں کا سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں میں درد ہونے لگا۔ رنگت
زرد پڑ گئی۔ ہاتھوں میں تشنج تھا۔ دماغ میں دھواں سا بھر گیا۔ تیزی سے کمرے کے
باہر آئے۔ چیخنے لگے۔ " دھوکہ، فریب، دغا۔ مار ڈالوں گا۔ ایک ایک کا خون کر ڈالوں گا"
سونے والے ہڑبڑا کر اٹھے اور دولھے میاں کے گرد جمع ہو گئے۔ دلہن کی نانی بھی آ گئیں۔
دولھے میاں نے ان کی طرف گھور کر دیکھا۔ "کیا دیکھ رہی ہو۔ مجھے دھوکہ دے کر۔ مجھے
اس طرح ذلیل و رسوا کر کے مجھے کیوں دیکھ رہی ہو؟ تمہاری چال کامیاب ہو گئی۔
میں تمہارے جال میں آ گیا۔ اب جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔ ورنہ میں …. ورنہ میں ——

ان کی مٹھیاں کس جاتیں۔ عالم اضطراب میں ٹہلنے لگے۔ دلہن کی نانی نے آگے بڑھ کر پوچھا "آخر کیا ہوا؟ کچھ تو کہو؟" دولہے میاں نے تلملا کر کہا۔ "بتاؤں تم سب نے مل کر مجھے الّو بنایا۔ لاوارث سمجھ کر الّو بنایا۔ لاؤ میری دلہن کہاں ہے ـــ لاؤ؟ وہاں تو صرف ایک تکیہ ہے۔ تم نے خوب دھوکہ دیا۔ تکیہ پر رضائی اوڑھادی ـــ گویا دلہن سو رہی ہے۔ اف۔ دھوکا۔ فریب۔ ماں ..... کہاں ہے میری ماں؟....."

سننے والوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں دلہن کی نانی اور خالہ اندر کمرہ میں گئیں۔ دولہے میاں ان کے پیچھے داخل ہوئے۔ ابھی دروازہ ہی میں تھے کہ دیکھا۔

وہ دونوں۔ ایک گٹھری کو مسہری کے نیچے سے باہر گھسیٹ رہی تھیں ـــ

دولہے میاں نے نڈھال ہو کر دروازہ کا سہارا لیا۔ دلہن کی نانی نے باہر آکر کہا۔ "بڑی شریر ہے" اور ساری عورتوں میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ اور اس کے بعد۔ قہقہوں سے سارا کمرہ گونج اٹھا۔

استعجاب

رات نے کہا "میں تمہارے گناہ کی پردہ پوش ہوں......" آسمان کے تاروں نے مہر بہ لب رہنے کا اقرار کیا۔ ضمیر نے بڑھ بڑھ کر تصیر کا دامن تھام لینا چاہا۔ اس کے قدموں تلے پامال ہو گیا...... جو قدم اٹھ گئے وہ کسی کے رکائے نہ رکے..... برآمدہ کی دیوار پر ایک سایہ حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ باہر الّو بول رہا تھا.... ہوا فرّاٹے بھر رہی تھی..... نیکی معصیت کے قدموں میں سسکیاں لے رہی تھی۔

ٹن ٹن ٹن۔ گھڑیال نے بارہ بجائے۔ سعیدہ کی ماں ہوشیار ہوتی تو سنتی کہ یہ ٹن ٹن ٹن کی آواز نہیں خطرہ کی گھنٹی ہے۔ گھڑیال چیخ رہا ہے۔ ہوشیار۔ ہوشیار۔ ہوشیار ایک سایہ برآمدہ کے چراغ کی دھندلی روشنی میں سیڑھیوں پر چڑھتا دکھائی دیا۔۔۔۔ گھڑیال کی آواز سن کر وہ ٹھیر گیا۔ دو سیڑھیاں نیچے اتر آیا گھڑیال نے آخری گھنٹہ بجایا۔ اور وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ چوروں کی طرح۔ گنہگاروں کی طرح۔ ایک بڑا سا کیڑا چراغ سے ٹکرا کر نیچے گرا۔ سایہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ سایہ کلک سینہ بائیں رخ پر ابھرا ابھر کر دب رہا تھا۔ اس کی گردن نے تیزی سے حرکت کی اس کے سر کو بے تحاشا جنبش ہونے لگی۔ کیڑے کے پروں کی بھنبھناہٹ کو سن کر وہ آگے بڑھنے لگا۔ یکے بعد دیگرے بیس سیڑھیوں نے اس کے قدموں کو روکنا چاہا ان قدموں کو جو ایک کمرہ کی طرف اٹھ رہے تھے۔ جہاں جوانی نیند کے آغوش میں خواب دیکھ رہی تھی۔ جہاں معصومیت کے

چراغ جل رہے تھے۔ بیسویں سیڑھی کا حلق دباتے ہوے وہ سایہ آگے بڑھا۔ دوسرے کمرے میں سونے والے نے کروٹ لی۔ خراٹوں کی آواز بلند ہو تی گئی۔ سایہ رک گیا۔ سایہ کی پیشانی پسینہ آلود ہو گئی۔ اس کے ہاتھ نے پیشانی سے پسینہ پونچھ کر زمین پر پھینکا۔ چاروں طرف سر کو موڑتا وہ سایہ ایک کونے میں غائب ہو گیا۔ تاریکی نے تاریکی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ تاریکی نے سایہ کی پیٹھ ٹھونکی۔ اس کو یقین دلایا کہ وہ جب تک موجود ہے۔ اس کے سایہ میں وہ محفوظ ہے۔ وہ اس کا پردہ پوش ہے۔ سایہ پھر دیوار پر قدم بڑھاتا دکھائی دیا۔ اس کمرہ کا دروازہ۔ اور۔ فر۔ فر۔ سایہ پھر اسی کونے میں غائب ہو گیا۔ تاریکی نے اسے پھر ڈھکیلا۔ وہ زور زور سے قدم رکھ رہا تھا۔ دروازہ کھلا فر۔ فر کی آواز لیکن۔ سایہ نے کوئی پروانہ کی کمرے کے دیواروں پر سبز رنگ پھیرا ہوا تھا لمپ کی سبز روشنی۔ دھندلی دھندلی۔ کمرہ کی سبز فضا کو اور بھی توبہ شکن بنا رہی تھی۔ سایہ کا ہاتھ اٹھا۔ سبز روشنی دھیمی دھیمی۔ اور دھیمی ہوتی گئی۔ پھر شعلہ کی تھرتھراہٹ ہوی۔ اور پھر ایکدم سے روشنی تیز کر دی گئی۔ سارا کمرہ چمک اٹھا۔ پلنگ پر کا سبز قالین بھی چمک رہا تھا۔ وہ سرخ و سفید چہرہ بھی چمک رہا تھا۔ ہاتھ کی چوڑیاں بھی چمک رہی تھیں۔ سایہ اس پلنگ کی طرف بڑھا۔ اس کا ہاتھ سیاہ زلفوں کو مس کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا اس سیاہی میں گم ہو جائے۔ اس نے جھک کر ان سیاہ زلفوں کو چوم لیا۔ سونے والے جسم کو کوئی حرکت نہ ہوی۔ نیم باز آنکھیں صرف دھوکہ دینے کے لئے تھیں۔ سونے والا کچھ نہیں دیکھ رہا تھا۔ ایک کروٹ اور۔ لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ نیند کی مسکراہٹ۔ خواب کی مسکراہٹ

سایہ کے قدم لرزنے لگے۔ اس کے ہاتھ بہک رہے تھے۔ اس کا سر زلفوں سے اوپر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دیوار پر دو سائے دکھائی دے۔ دوسرے سایہ کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس سایہ کے لب ہلے۔ اور یہہ آواز کمرے میں پھیل گئی۔ "تم کون ہو؟ بدمعاش!!" اس ہیبتناک سایہ کے بھی لب ہلے۔ "تم بڑی اور اچھی ہو گئی ہو۔ میں نے تمھیں تین سال پہلے دیکھا تھا۔ اس قدر جلد۔ اتنی ممل" کمرہ ان الفاظ سے گونج رہا تھا۔ "اس لئے تمہاری یہہ جراٴت۔" "مجھے معاف کرو۔ میں خود نہیں سمجھ سکتا میں کیا کر رہا ہوں میں اپنے آپ میں نہیں ہوں۔ میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔ افوہ میرا دماغ چکرا رہا ہے۔ یہہ تم ہو۔ میرے سامنے تم ہو۔ یہہ سایہ بھی تمہارا۔ دیکھو وہ کس قدر لمبا چوڑا ہے۔ تم اتنی سی تھیں۔ میری کمر برابر۔ آج سے تین سال پہلے۔ تم میں اس وقت کچھ نہ تھا۔ کیا تھا کچھ؟ تم ایک بیجان سی گڑیا تھیں۔ تم میں نہ رنگ تھا نہ روپ تھا۔ تمہارے بال بھی تو اتنے لانبے نہ تھے۔ تمہارے ہاتھ پاؤں بھی تو اتنے بھرے بھرے نہ تھے۔ میں نے کبھی تمہیں اس تعجب اور ایسی نظروں سے دیکھا تھا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ تم وہ نہیں ہو" سایہ آگے کو جھک رہا تھا۔ "تو اب تمہارا مطلب کیا ہے؟" "مطلب؟ ہاں مطلب تو ہونا چاہیئے۔ میں سچ کہتا ہوں۔ میرا کوئی مطلب نہیں۔ یہہ میرا تعجب یہہ میری حیرت دیکھو۔ انھوں نے مجھے یہاں کھینچ لایا۔ میں تمھیں دیکھتا رہنا چاہتا ہوں۔" تمہاری شرافت دیکھ لی۔ جاؤ۔" لمپ کی روشنی اور تیز ہو گئی۔ دیوار پر سائے پھیکے پڑ گئے۔ "جاؤ" آواز میں سختی آگئی۔ "اگر تم مجھے یقین دلادو کہ تم وہی ہو" "ہاں میں وہی ہوں۔ مگر اب جاؤ" ایک سایہ دروازہ کی طرف بڑھتا ہے اور دوسرا پلنگ کی طرف۔ دروازے کے قریب

پہونچنے کے بعد وہ سایہ مڑا۔ دیکھا کہ وہ مسکرا رہی ہے۔ وہ سایہ پھر پلنگ کی طرف بڑھنے لگا
بیٹھا ہوا سایہ کھڑا ہو گیا۔ "تم بھی کتنے ذلیل انسان ہو جی۔ راتوں کو ایک غیر لڑکی کے کمرہ
میں گھس آئے۔ میرا تمہارا رشتہ تو اس کی اجازت نہیں دیتا۔ تم۔ جاؤ نہیں تو میں بلاتی ہوں
اماں کو" سایہ تیزی سے دروازہ کی طرف بڑھا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز۔ پھر چیختی چڑچڑاتے
کی گھڑیال نے اطمینان کا سانس لیا۔ ٹن۔ ایک بج رہا تھا۔ سایہ جھوم جھوم کر سیڑھیاں
اتر رہا تھا۔ بغیر کچھ سوچ بچار کئے نصیر نے اپنے رشتہ دار کا گھر چھوڑ دیا۔ ایک سایہ باہر کی
دیوار پر متحرک ہوا۔ اور پھر تاریکی میں غائب تین سال کے بعد نصیر اس رشتہ دار سے ملنے آیا
تھا۔ ان کو ہمیشہ شکایت رہے گی کہ نصیر آیا بھی اور بغیر پوچھے گچھے راتوں رات چلا بھی گیا۔
کیوں ؟ آخر وجہہ ؟ وہ اور ان کی بیوی۔ ایک دوسرے سے تبادلہ خیالات کرتے
اور ان کی بچی سعیدہ خاموش رہتی۔

———×———×———×———×———
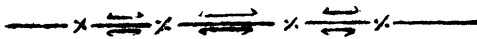
قریب نظر

آ میری سہیلی ۔ قریب آ ۔ اور قریب یہہ تکیہ ہٹا دے ۔ میں اپنی قبر میں سے بول رہی ہوں
اس لئے گھٹی ہوی آواز سنائی دے گی ۔ میں زندہ نہیں ہوں ۔ میں زندہ نہیں ہوں ۔ میں
قبر میں کیسے گئی ؟ کون اس کے لئے جواب دہ ہو سکتا ہے ؟ یہی میں کہنا چاہتی ہوں ! آ ۔
قریب آ ۔ ڈرتی کیوں ہے ۔ میں زندہ ہوں ۔ کیا اس لئے ۔ یہہ سانس کی گرمی تجھے جھلس نہ دے گی ؟
یہہ دل کی دھڑکنیں تجھے دہلا نہ دیں گی ۔ ! اس دھڑکن سے میں بھی بہت ڈرتی ہوں ۔
ہر دھڑکن پر یہہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے کان کے قریب نقارہ لاکر زور سے اس پر چوٹ
لگائی ہو ۔ گھن ۔ مگر تو نے اب تک میری بیمارداری کی ۔ تیرے لئے میں نے سب کو چھوڑا ـــــ
عزیز اقارب، بھائی، بہن ۔ محبوب اور اس دنیا کو بھی ۔ سن ! چراغ کو اور ذرا بڑھا دے
میں تیری صورت اچھی طرح دیکھ لینا چاہتی ہوں ۔ نہیں نہیں ۔ یہہ شعلہ بہت خوفناک ہے
اس میں ایک چہرہ کی سرخی ہے ۔ اس کی زبان بہت تیز ہے ۔ اس کی زبان پر پروانوں کا
خون چڑھا ہوا ہے ۔ یہہ آگ کے دیوتا کی چھوٹی مورتی ہے ۔ اسے روز وقت مقررہ پر قربانی
چاہئے ۔ ظالم، بیدرد ۔ بجھا دے ۔ اسے بجھا دے ۔ اور تو میرے قریب آ ۔ سن رہی ہے ۔
میں اب تجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں ۔ میں جب تک نہ کہوں گی ۔ میرا دل دھڑکتا رہے گا ۔
میری سانس چلتی رہے گی ۔ میری نبض حرکت کرتی رہے گی ۔ دیکھ تو ۔ اب میں اپنی زبان
کھولنے والی ہوں تو یہہ سانس کتنی تیزی سے اپنے ساتھیوں کو باہر نکال رہی ہے ۔

دل کی دھڑکنوں میں بھی کمی ہوتی جا رہی ہے۔ نبض بھی اپنا راستہ ٹٹول رہی ہے۔ سب جانے کی تیاری میں ہیں۔ سن۔ سن! میری روح، یہہ مرا راز، مجھ میں یہہ راز نہ ہوگا تو روح بھی نہ ہوگی اور جس نے بھی اس راز کو سن لیا وہ زندہ ہے۔ مجھے تیری گرم گرم سانسوں کا احساس ہو رہا ہے اف تیرے ہاتھ کس قدر سخت ہیں۔ مگر تو تو میری سہیلی ہے۔ آہ مجھے میرے ماں باپ یاد آرہے ہیں تو کہہ۔ دو چار بار "بیٹی" کہہ میرے ماں باپ! ان کے دل بڑے سخت ہیں۔ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ اور جس نے محبت کرنے کی قسم کھائی۔ جس نے محبت کا یقین دلایا۔ اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ مجھے اپنی محبت سونپنے کے لئے اس نے مجھے گھر کی چار دیواری سے باہر نکالا۔ وطن سے باہر لایا۔ ماں باپ سے چھڑا دیا۔ صرف محبت کے راز کو مجھ پر ظاہر کرنے —— ایک خوشنما، پرفضا اور رنگین مقام ہماری محبت کا مدفن ہے۔ میں اس کے ساتھ گئی۔ ماں باپ سے پوچھا نہ دماغ سے۔ دل محبت کا آرزومند۔ اس نے مجھ سے کہا جا۔ تیرا دل محبت کا پیاسا ہے۔ یہہ تجھے محبت کی شراب سے مدہوش کر دے گا۔ دیکھتی نہیں۔ اس کی آنکھیں تجھے دیکھ کر کتنی مدہوش ہو جاتی ہیں۔ اس کے دل کی شراب اس کی آنکھوں کے پیمانوں میں چھلکنے لگتی ہے۔ تو اپنے دل میں اس شراب کو انڈیل لے۔ تو محبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تیرے کمزور دل کو اسی قوت کی ضرورت ہے۔ جا۔ اور میں چلی گئی سنتی ہے میں چلی گئی۔ وہ جہاں لے گیا۔ وہاں چلی گئی۔ اس نے مجھے اپنے دل میں بٹھایا۔ آنکھوں میں بٹھایا۔ وہ میرے پاوں تلے پامال ہوتا وہ میری ابرو کے بل پر موت و حیات کو منحصر سمجھتا۔ وہ میرا محبوب میں محبت سے اپنا دامن بھر رہی تھی۔ میں نے اپنے محبوب کی ساری محبت چھین لی

اس کی آنکھوں سے اس کی ساری محبت جذب کرلی ۔ اس کے دل میں محبت کا ایک شمہ بھی
باقی نہ رکھا ۔ میں نے چند ہی دنوں میں اس کی محبت کا دیوالیہ نکال دیا ۔ اور اس کے پاس
محبت نہ رہی ۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا ۔ میں کہاں جاتی ؟ میرے لئے میرے ماں باپ زندہ
نہ تھے ۔ میرا وطن میرے لئے ایک انچ جگہ نہ دے سکتا تھا ۔ ؟ اور یہ سب کیوں ؟ میں نے
محبت سیکھنی چاہی ۔ اپنے محبوب کے ساتھ ہنسی خوشی چلی گئی ۔ وہ بڑا اچھا آدمی تھا ۔ اس نے
مجھ سے خوب محبت کی ۔ مگر جب محبت ہی نہ رہی تو چلا گیا ۔ میں نے اس کے پاس ذرا سی
محبت بھی نہ چھوڑی ۔ میں اس کا انتظار کرتی رہی ۔ امیر لوگ چند دن کے لئے ہاتھ پھیلائیں
تو برا نہیں معلوم ہوتا ۔ کیوں !! میں محبت سے مالا مال تھی میں نے بھیک مانگتے ہوئے اس کے
انتظار میں کئی برس گزار دیے ۔ تو نے مجھ پر بڑا احسان کیا ۔ اپنی چھوٹی بہنوں کو میری مدد کے لئے
بھیج دیا ۔ مجھے بھیک بھی نہ مانگنے دیا ۔ انھوں نے میری دلجوئی اور ہمدردی میں کوئی کسر اٹھا نہ
رکھی ۔ دیکھ تو وہ دم بھر پہلے یہیں تھیں ۔ لوگ ان سے ڈرتے ہیں ۔ کیسے کیسے بھیانک نام
دے رکھے ہیں ۔ دق ۔ سل ۔ کیا ۔ کیا ۔ میں تو بالکل نہیں ڈری ۔ میں اب بالکل اچھی ہوں
ان کو تو نے ہی ہٹا دیا ہو گا ۔ مگر تو سن رہی نا ۔ ہاں ہاں ۔ میری آواز حلق میں پھنس رہی ہے
ذرا میرا حلق تو سہلا ۔ آہا ۔ بس ۔ ب ..... س " چپ رہو ۔ مریض بات نہیں کیا کرتے "۔۔۔
موت نے لمبا سانس لیا ۔ مریض کی ساری سانسیں سمٹ کر آ گئیں ۔ مریض ہمیشہ کے لئے خاموش
ہو گیا ۔ نبض بند ہو گئی ۔ دل خاموش ہو گیا ۔ اور موت ! بے سہاروں کا سہارا ....
ٹوٹے ہوئے دلوں کا مرہم ۔ رازدار محبت ۔ دکھ درد سے آزاد کرنے والی سہیلی ۔۔۔۔ !!

مرنے والی کے سرہانے آنسو بہاتی بیٹھی رہی ۔"اسی وقت" ایک مغربی طرز پر آراستہ پیراستہ کمرہ میں ایک سرخ رنگ کے لچکدار اور دبیز صوفے پر بیٹھے ہوئے ایک وجیہہ مرد نے ایک خوبصورت نوجوان لڑکی سے کہا۔ "تم آؤ۔ میرے قریب ۔ اور قریب"۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا ۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں ۔تم کو اپنی زندگی کا خواب سمجھتا ہوں ۔تم میرے دل میں رہتی ہو میری آنکھوں میں تمہارے جلوے تڑپتے ہیں ۔میں نے آج تک کسی سے محبت نہیں کی ۔ کسی عورت میں اتنی قوت نہ تھی کہ وہ میرے دل سے سارے ہتیار چھین لے میرا دل۔ اس کو صرف تم نے مجبور کر دیا ۔میں نے آج تک کسی عورت سے محبت نہیں کی ...." اس کا سر جھک گیا ۔تھوڑے وقفہ سے اس نے کہنا شروع کیا ۔"میں چاہتا ہوں میرا کوئی معبود ہو۔ کسی کے آستانے پر میرا سر جھک جائے ۔کوئی میرے دل کو اپنی پلکوں سے اٹھالے ۔ دیکھو میری طرف دیکھو ۔کیا تم کو میری محبت کا یقین نہیں ۔میں تمھیں کتنا چاہتا ہوں ۔یہہ اس پروانہ سے پوچھو جو شمع کے گرد چکر کاٹ رہا ہے !! میری روح تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے تم اپنی آنکھیں میرے قریب کر دو ۔تاکہ یہہ پیغام تم تک پہونچ جائے (لمپ کی روشنی کم ہونے لگتی ہے) بس اب پروانہ بہت جل چکا ۔ صبح کے وقت ایک حسین نوجوان لڑکی ۔ایک خوشنما پر فضا ۔رنگین مقام کی طرف ایک وجیہہ نوجوان کے ساتھ جارہی تھی ۔لڑکی نے اس مرد کا سہارا لیتے ہوئے کہا "تم سمجھتے ہوگے میں تمہاری دولت پر ریجھ گئی ۔تمہارے خوبصورت چہرہ پر فریفتہ ہوگئی ۔میں نے پہلے پہل نہیں دیکھا تو میں نے نہ تو تمہاری دولت کو دیکھا نہ چہرہ کو میں تو صرف تمہاری آنکھوں کو دیکھتی رہی ۔ان آنکھوں میں محبت کا دریا موجیں مارتا ہے ۔ان آنکھوں میں خلوص اور صداقت کے نقوش ہیں ۔میری آنکھوں نے

میرے دل نے تمہاری آنکھوں سے تمہارے دل کا راز جان لیا۔ تم محبت کے اتھاہ سمندر کو اپنے قبضہ میں رکھتے تھے۔ میں نے صرف اپنی محبت کی آگ بجھانے کے لئے تمہارا دامن پکڑا۔ آہ میں کس قدر خوش نصیب ہوں۔ یہہ جگہ کتنی خوش نما ہے۔ ہر چیز خوش نما ہے۔ تم بھی اس سے پہلے یہاں آئے تھے؟" شاید ـــــ مگر اس وقت تم ساتھ نہ تھیں اور تھوڑی دیر سوچ کر۔ "میں تنہا تھا ـــــ" "میں تمہیں کبھی نہ چھوڑوں گی"۔ لڑکی نے کہا اور رونے لگی۔

اِدارۂ ادبیاتِ اُردو کی دوسری مطبوعات

ورڈزورتھ اور اسکی شاعری

اس کتاب میں مولوی میر حسن صاحب ایم اے نے ورڈزورتھ کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ اس کے تجرباتِ حیات نے جس جس طرح سے اس کے شعری رجحانات کی تعمیر و تشکیل کی ہے ان کو واضح کیا ہے بہت سی نظموں کا اُردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ ورڈزورتھ کا پایہ انگریزی شاعری میں بہ حیثیت فطرت نگار بہت بلند ہے۔ اور جدید اُردو شاعری اس سے خاص کرمتاثر ہوی ہے۔ اردو والوں کے لئے اس کے حالات اور کلام کا مطالعہ افادہ سے خالی نہیں۔ عہم

رسالۂ ہندوستانی۔ الہ آباد "اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ شاعر کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً اس کے تجرباتِ حیات نے جس جس طرح اس کے شعری رجحانات کی تعمیر و تشکیل کی ہے ان کو واضح کیا گیا ہے۔ سوانح نگاری کا یہ طرز عام روش سے علحدہ ہے اور چونکہ فطری اصول کے مطابق ہے اس لئے نہایت پسندیدہ ہے...... انگریزی کے ذخیرہ ادب کو جلد سے جلد اردو میں منتقل کرلینا اردو کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اس اعتبار سے مصنف نے ورڈزورتھ کے حالاتِ زندگی کے ساتھ اس کی نظموں کو اُردو زبان میں منتقل کرکے دراصل اُردو کی ایک نہایت ضروری خدمت انجام دی ہے..... ہمارے جدید مطبوعات میں یہ ایک مفید اور دلچسپ اضافہ ہے"

رسالہ معارف ۔ اعظم گڈھ ۔ "ورڈز ورتھ انگریزی ادب کا معیاری شاعر ہے جناب میر حسن نے اس کو اُردو داں طبقہ سے روشناس کیا ہے ۔ اس رسالہ میں اس کے سوانح اور کلام کو پیش کیا ہے ۔ اور اس کی طبیعت پر فلسفہ اور شعر کے جس مسلک و مشرب کے رجحانات رہے سب کو اسی سلسلہ میں بیان کیا ہے اور پھر اس کی زندگی اور شاعری پر جو تنقیدیں ہوئیں اور خود مرتب کو اس کی شاعری میں جو معیار اور اس کے فلسفہ میں جو رجحان نظر آیا اس کو اسی سلسلۂ سوانح میں بیان کیا ہے اور جا بجا دوسرے شعراء سے اس کا موازنہ بھی کیا ہے ۔ مولف نے یہہ ایک اچھا طریق سوانح نگاری اختیار کیا ہے اگر اسی رنگ پر وہ دوسرے باکمال شعرائے یورپ کو روشناس کرنے میں کامیاب ہوجائیں جیسا کہ اُن کا مقصد ہے تو اُردو کی ایک مفید خدمت انجام دیں گے ۔"

رسالہ زمانہ ۔ کانپور ۔ "ورڈز ورتھ کے سوانح حیات کے علاوہ اس کی شاعری پر بھی ایک فاضلانہ نظر ڈالی گئی ہے، اور ورڈز ورتھ کی ایک عمدہ تصویر بھی دی گئی ہے قابل مصنف نے نہایت محنت اور دماغ سوزی سے کام لے کر یہہ کتاب مرتب کی ہے اُردو داں پبلک خصوصاً شعراء حضرات کو اس کی قدر کرنی چاہئے ۔"

رسالہ نگار ۔ لکھنو ۔ "وہ لوگ جو خالص ادبی ذوق رکھتے ہیں اور مشرق و مغرب دونوں جگہ کی شاعری پر مقابلاً نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہہ کتاب خصوصیت کے ساتھ قابل قدر ہے ۔"

رسالہ اُردو - اورنگ آباد........"میر حسن صاحب نے یہہ بہت قابل قدر کام کیا ہے - کہ ورڈز ورتھ کے حالات اور اس کی شاعری کی خصوصیات کو اُردو زبان میں بیان کیا - قابل مولف نے جگہ جگہ اس کی منتخب اور عمدہ نظموں کے ترجمے بھی درج کئے ہیں - نظم کا ترجمہ بہت دشوار کام ہے لیکن مولف نے عموماً اس دشوار کام کو بھی خوبی سے انجام دیا ہے - میر حسن صاحب کی محنت قابل شکر اور لایق قدر ہے اور اُردو شعراء کو یہہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئیے -"

ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی صدر شعبۂ مشرقی جامعۂ الہ آباد....

"کتاب اچھی اور بہت اچھی ہے اور بہت سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے - میں نے اسے خاص دلچسپی سے پڑھا -"

پروفیسر ای ای اسپیٹ بی اے - سابق پروفیسر ادبیات انگریزی جامعہ عثمانیہ......

"یہہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا مطالعہ میں نے بڑی دلچسپی سے کیا اور میں ذاتی طور پر واقف ہوں کہ اس کی تیاری میں مسٹر میر حسن نے بڑی محنت اور جانکاہی سے کام لیا ہے جن ماخذوں سے انھوں نے استفادہ کیا ہے وہ مستند اور کافی تعداد میں ہیں -"

ٹیگور اور ان کی شاعری

ٹیگور کی شاعرانہ عظمت سے کون ناواقف ہے ان کی شاعری نے بین الاقوامی مقبولیت حاصل کی ہے "ٹیگور اور ان کی شاعری" اس شاعر مشرق پر سب سے پہلی مستقل کتاب ہے

جس میں مخدوم محی الدین صاحب ام، اے نے ٹیگور کی شخصیت ان کی ادبی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں اور ان کے فلسفۂ زندگی پر اجمالی نظر ڈالی ہے۔ ٹیگور کا پیام گاندھی اور ٹیگور اور شانتی نکیتن پر علحدہ ابواب میں تفصیلی بحث کی ہے عہم

رسالہ اردو۔ اورنگ آباد "ٹیگور کی مختلف تحریروں کے تراجم اردو زبان میں کثرت سے شایع ہو رہے ہیں، لیکن اب تک کوئی ایسی کتاب نہ لکھی گئی تھی جو اُن کی شخصیت کو واضح کرتی......

......پیش نظر کتاب میں ٹیگور کی شخصیت ان کی ادبی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں اور ان کے فلسفہ زندگی پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب میں انسان اور فلاسفر کی حیثیت سے ٹیگور پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت غنیمت ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس کے لکھنے میں مخدوم صاحب نے محنت کی۔ اور با مذاقی و سلیقہ مندی کا ثبوت دیا ہے"

مجلہ عثمانیہ۔ حیدر آباد......"اس کتاب میں.....ٹیگور کے حالات زندگی اور مختلف ادوار شاعری پر دلچسپ پیرایہ میں روشنی ڈالی گئی ہے......مخدوم محی الدین صاحب جامعہ عثمانیہ کے ہونہار شاعر ہیں اور انھوں نے اپنے اس مفوضہ فریضہ (تصنیف کتاب) بوجوہ احسن انجام دیا ہے۔ لیکن ہمیں مسرت ہے کہ انھوں نے اُردو ادب میں ایک ایسی چیز کا اضافہ کردیا ہے جو کسی طرح رائیگاں نہیں جاسکتی۔"

ہوش کے ناخن (ڈرامہ) اس ڈرامہ کو میرحسن اور مخدوم محی الدین صاحبان نے اسٹیج کے لئے لکھا چنانچہ دو مرتبہ اسٹیج ہو کر اس نے

کافی مقبولیت حاصل کی۔ اس میں حیدرآباد کی سماجی زندگی کو دل آویز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یوں تو یہہ ایک انگریزی ڈرامہ سے ماخوذ ہے لیکن اس طرح اپنا کر پیش کیا گیا ہے کہ بجائے خود تصنیف ہو گیا ہے۔ زبان سلیس اور مذاق لطیف ہے ۱۲ر

رسالہ نگار۔ لکھنو۔ "ڈرامہ ہے جسے حیدرآباد کے دو فاضل نوجوانوں نے اسٹیج کے لئے لکھا ہے اور جس میں حیدرآباد کی سماجی زندگی پیش کی گئی ہے یوں تو یہہ ایک انگریزی ڈرامہ سے ماخوذ ہے لیکن پیش کیا گیا ہے ایسی صورت سے کہ بالکل اپنی چیز معلوم ہوتا ہے یہہ دو بار حیدرآباد میں اسٹیج ہو کر لوگوں کی پسندیدگی بھی حاصل کر چکا ہے"

مجلہ عثمانیہ۔ حیدرآباد۔ "بڑی حد تک اچھی معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تصنیف میں میر حسن اور مخدوم محی الدین صاحبان نے خاص ذوق اور سلیقہ سے کام لیا ہے..... تقریب (یوم کلیہ) میں نہایت خوبی سے پیش بھی کیا گیا..... اس کو اتنا پسند کیا گیا کہ کچھ عرصہ کے بعد انجمن طیلسانین عثمانیہ کی خواہش پر اس کو دوبارہ اسٹیج کیا گیا"

جریدۂ رہبر۔ حیدرآباد۔ "اس میں بلاشبہ حیدرآباد کی سماجی زندگی کے بعض پہلو بڑی عمدگی سے آ گئے ہیں۔ اور زبان سلیس اور مذاق لطیف ہے"

یوسف ہندی قید فرنگ میں

از مولوی محسن بن شبیر صاحب بی۔اے۔ ال ال بی

اس کتاب میں غالب کی قید کے واقعہ پر محققانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس زمانہ کے قیدیوں کی حالت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے آخر میں غالب کا ترکیب بند اسیری بھی نقل کیا گیا ہے ۔۸ر

رسالۂ اردو۔ اورنگ آباد۔ اس رسالہ میں نہایت محنت سے غالب کی قید کے واقعے کی تحقیق کی گئی ہے......... اس زمانہ کے قیدیوں کی جو حالت ہوتی تھی اور جو سلوک ان کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا اس کی تصویر پیش کی گئی ہے...... آخر میں ترکیب بند اسیری پورا نقل کر دیا گیا ہے۔

مرقع سخن (جلد اول) یہ دکن کے پچیس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے جس کی تالیف میں جامعۂ عثمانیہ کے متعدد اساتذہ، طلبہ، فارغین اور اہل قلم کی کوششیں شریک ہیں۔ یہ تذکرہ پانچ ادوار پر منقسم ہے۔ ہر دور کے شروع میں ایک تمہید ہے جس میں اس کی ادبی خصوصیات کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد اس عہد کے مشاہیر شعراء کے حالات، ان کے کلام کا نمونہ اور اس پر تبصرہ ہے۔ شعراء کے تذکرے کے ساتھ ان کے دیگر ہم عصر دکنی اور شمالی ہند کے شعراء کے نام جو اس عہد میں دکن میں تھے یا جن کی شہرت شمالی ہند میں تھی، دیئے گئے ہیں۔ شعراء فرمانروایان دکن اور قدردانان ادب و شعر کی پچاس تصویریں بھی ہیں۔

رسالۂ معارف۔ اعظم گڈھ۔ یہ تذکرہ پانچ ادوار پر تقسیم ہے۔ ہر دور کے شروع میں ایک تمہید ہے جس میں اس دور کی ادبی خصوصیات کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد اس عہد کے چند مشاہیر شعراء کے حالات، ان کے کلام کا نمونہ اور اس پر تبصرہ ہے۔ اور شعراء کے تذکرے کے ساتھ ان کے اور ہم عصر دکنی اور شمالی ہند کے ہم عصر شعراء جو اس عہد میں دکن گئے یا جن کی شہرت شمالی ہند میں تھی نام دیئے گئے ہیں۔ اس طرح

یہہ تذکرہ گویا دکن کی شاعری اور اس کی تدریجی ترقی کی پوری تاریخ ہے ......
حالات کے ساتھ اُن (شعراء) کے اور ان کے اکثر ہم عصر دکنی شعراء، فرمانروایانِ دکن
اور متعدد ادب و شعر کے قدر دانوں کی تصاویر بھی دیدی گئی ہیں جن سے معنوی خوبیوں
کے ساتھ یہہ تذکرہ حسن ظاہر کا بھی مرقع بن گیا ہے ۔"

جریدۂ مشیر دکن۔ حیدرآباد .... "بڑے سلیقہ اور عمدگی
کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے اور ہزاروں روپیہ کے صرفہ سے شائع کیا گیا ہے......
ڈاکٹر زور نے اس کتاب کو شائع کر کے بجا طور پر ملکی ادب کی بہت بڑی اور لایق تحسین
خدمت انجام دی ہے جس کے لئے وہ اہل ملک کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں ۔
مرقع سخن حقیقتاً عہد آصفیہ کے ممتاز شاعروں کا ایک مرقع ہے۔ ہر صاحب
ذوق کو اس کا ایک نسخہ اپنے پاس ضرور رکھنا چاہیئے ...... بعض تصویریں تو پہلی
دفعہ شائع ہوئی ہیں ۔"

مرقع سخن (جلد دوم) مرقع سخن کا دوسرا حصہ ہے جس میں پچاس شعرائے دورِ
آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے ۔ اس کی ترتیب بھی اسی ڈھنگ پر ہے جیسی پہلے کی ہے
اس میں بھی پچاس تصاویر شائع کی گئی ہیں ۔ ان دونوں کتابوں سے حیدرآباد کی گزشتہ
اور موجودہ شاعری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ صہ

رسالہ اُردو۔ اورنگ آباد .... "دوسری جلد میں بھی دور آصفیہ
کے پچاس شعرا کا تذکرہ اور کلام ہے اور اس کی ترتیب بھی اسی ڈھنگ پر ہے

جیسی پہلی کی ہے۔ تصویروں نے جو کثرت سے ہیں کتاب کا حسن بڑھا دیا ہے اُردو شاعری کا فروغ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں مرحوم کے زمانہ سے شروع ہوا اور روز بہ روز ترقی پر ہے اس وقت ہیں یعنی حیدرآباد میں بہت سے خوش گو شاعر موجود ہیں ان دونوں جلدوں سے حیدرآباد کی گذشتہ اور موجودہ شاعری کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔"

سراج سخن پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری نے شاہ سراج اورنگ آبادی کے کلام کا انتخاب کیا ہے۔ سراج اُردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ اگرچہ ان کا زمانہ دوسو سال پہلے کا ہے لیکن ان کا کلام بہت صاف ہے۔ جس کا یہ دلچسپ اور معیاری انتخاب ہے جس کی قیمت سروری صاحب کے محققانہ اور پراز معلومات مقدمہ سے بہت بڑھ گئی ہے۔ ۱۲ر

مجلہ عثمانیہ - حیدرآباد:"مولوی عبدالقادر سروری صاحب نے حضرت سراج اورنگ آبادی کے کلام کا نہایت دلچسپ اور معیاری انتخاب کیا ہے اور ساتھ ہی دکن کے اس عظیم الشان شاعر کے حالات زندگی اور طرز سخنوری پر نہایت محققانہ اور پُراز معلومات مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ مولوی سروری صاحب کو شعروسخن کا بڑا اچھا ذوق ہے۔ اور ہم چشموں میں وہ اپنی سخن فہمی کی وجہہ سے خاص شہرت رکھتے ہیں۔"

جریدۂ مشیر دکن - حیدرآباد

"قدیم طرز کے شاعروں میں ولی کے بعد سراج کے مقابلے کا کوئی شاعر نہیں۔ یہہ ان کے

کلام کا ایک پاکیزہ انتخاب ہے۔ غزلیات کے علاوہ دیگر اصناف کلام کا ضروری اور دلچسپ انتخاب بھی درج ہے۔ مرتب نے سراج کی شاعری اور حیات پر ایک پُر از معلومات مقدمہ لکھا ہے "

ایمان سخن مولوی سید محمد صاحب ایم اے۔ نے عہد آصفجاہ ثانی کے ملک الشعرا شیر محمد خان ایمان کے کلام کا انتخاب کیا ہے جس کے ساتھ ان کا بلند پایہ مقدمہ بھی ہے جس میں انھوں نے ایمان کے حالات پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ ۱۲ر

فیض سخن میر شمس الدین محمد فیض اردو شاعری کے مسلم الثبوت استاد تھے صاحب دل بزرگ مانے جاتے تھے۔ ان کا حلقۂ تلامذہ بہت وسیع تھا اس طرح وہ ایک خاص مکتب شاعری کے بانی بن گئے تھے جو عاشقانہ شاعری میں تصوف کی رنگ آمیزی کرتا تھا۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے حضرت فیض کے کلام کا انتخاب شایع کیا ہے اور اس کے ساتھ ان کا ایک مقدمہ بھی ہے جس میں فیض کی حیات اور شاعری پر بحث کی گئی ہے۔ ۱۲ر

مشیر دکن۔ حیدرآباد

زیر نظر کتاب استاذ کل حضرت میر شمس الدین محمد فیض کے کلام کا انتخاب ہے۔ ڈاکٹر زور صاحب کا عمومی دیباچہ بھی ہے اور فیض اور ان کی شاعری پر ایک اچھا مقدمہ بھی انتخاب میں رباعیاں، مخمس، مثلث، قصائد اور تاریخ وغیرہ

سب کچھ آگیا ہے۔ حضرت فیض کے رسالہ فیض کا بھی انتخاب دیا گیا ہے۔ غرض یہ انتخاب بہت حد تک مرتب صورت میں شائع ہوا ہے۔

بادۂ سخن ڈاکٹر احمد حسین مائل مرحوم کے کلام کا دلچسپ اور معیاری انتخاب ہے۔ مائل مرحوم دکن میں پیدا ہوئے اور دکن میں پرورش پائی لیکن زبان وہ پیدا کی کہ دہلی والوں کی محفلوں میں سراہے گئے۔ ان کے کلام میں خدا داد بے تکلفی ہے۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر زور کا مقدمہ عمومی بھی ہے اور انھوں نے شاعر کے حالات بھی لکھے ہیں۔ ۱۲ر

رسالہ ساقی۔ دہلی۔ "ڈاکٹر احمد حسین مائل مرحوم کے کلام موزوں کا انتخاب ہے اور نہایت خوبصورت انتخاب ہے مائل مرحوم دکن میں پیدا ہوئے۔ دکن میں پرورش پائی لیکن زبان وہ پیدا کی کہ دہلی والوں کی محفلوں میں سراہے گئے۔ کلام میں جس قدر ہمارے پیش نظر ہے آمد ہی آمد ہے .... ان کے کلام میں جو بے تکلفی ہے وہ خداداد ہے اور مقدمے میں دکن کی اردو شاعری پر جو مقدمہ لکھا گیا ہے وہ تو نہایت بصیرت افروز ہے اس لئے اردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بادۂ سخن میں بہت سی کار آمد چیزیں مل سکتی ہیں۔"

رسالہ جامعہ دہلی۔ "حضرت مائل (صاحب بادۂ سخن) ایک قادر الکلام اور پرگو استاد ہیں۔ مشکل پسند واقع ہوئے ہیں، اور عموماً سنگلاخ اراضی شعر کو نہ منتخب کرتے ہیں اور بعض قدیم مسلم الثبوت اساتذۂ اردو کے تتبع کی کامیاب و قابل داد کوششیں کی ہیں۔"

کیفِ سخن حضرت کیفی ایک بوقلموں طبیعت کے سخن گو ہیں۔ آزادمنشی و لطیفہ سنجی ان کے کلام میں جابجا جھلکتی ہے۔ وہ حیدرآباد کے جدید نشاۃ ادب کے بلند بانگ طرح اندازوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر زورؔ نے کیفِ سخن کے نام سے ان کے کلام کا انتخاب ایک معلومات آفریں مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ۱۲ر

رسالہ ساقی۔ دہلی...... "کیفِ سخن ان (کیفیؔ مرحوم) کے پُرلطف کلام کا نہایت لطیف انتخاب ہے۔ ہر شعر ان کے مذاقِ سلیم کا گواہ ہے۔ کلام میں اس قدر سادگی ہے کہ طبیعت پڑھنے سے تھکتی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت سیدھی سادی زبان میں سامنے کے مضامین لکھنے کی زیادہ عادی تھی...... یہہ مجموعہ انتخاب زبان، تخیلات، روانی، اسلوب اور صفائی وغیرہ ہر لحاظ سے اچھا ہے"

رسالہ جامعۂ۔ دہلی........ حضرت کیفیؔ (صاحب کیف سخن) ایک بوقلموں طبیعت کے سخن گو ہیں...... آزادمنشی و لطیفہ سنجی ان کے کلام پر بخط جلی لکھی ہوی ہے اور حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے جدید دورِ احیاء العلوم ونشاۃ ادب کے بلند بانگ و قومی آہنگ نقیب ہیں۔ کیفیؔ اک جامع قال و حال انسان تھے"

متاعِ سخن نواب عزیز یار جنگ بہادر، فصیح الملک داغؔ کے شاگرد اور حیدرآباد کے ایک پختہ مشق شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں ادبی لطافت اور سادگی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے ان کے حالات اور ان کی شاعری پر تبصرے کے ساتھ ان کے کلام کا لطیف انتخاب پیش کیا ہے۔ ۱۲ر

رسالہ ساقی ۔ دہلی ...... "یہہ جناب عزیز کا انتخابی کلام ہے مگر نہایت پاکیزہ جذبات سے لبریز اور شاعری کا پورا نمونہ .... ان (عزیز حیدرآبادی) کا شاعرانہ ذوق دیکھ کر یہہ سمجھ میں آیا کہ حضرت ذوق مرحوم کے دل میں دکن نے کیوں چٹکی لی تھی اور میرانیس مرحوم کس لئے حیدرآباد تشریف لے گئے تھے ۔ اگر میرے سامنے جناب عزیز کی صرف شاعری ہوتی اور ان کے احوال سے بے خبر ہوتا تو میں بلا مبالغہ یہہ سمجھتا کہ مومن خاں مرحوم کا کوئی شاگرد ان کی بعض خصوصیات سے علحدہ ہوکر مرزا داغ کی زبان بول رہا ہے ۔ زبان میں ان کی لغزش نہیں ۔ بیان میں ان کے زور بندش اُن کی چست غرض کہ شاعری کے لئے جس کیفیت کی ضرورت ہے وہ ...... اُن کے کلام میں پائی جاتی ہے ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور کا احسان ماننا چاہئے کہ انھوں نے ...... دکن کے تین قابل قدر شعراء کے کلام سے ہمیں روشناس کرایا"

رسالہ جامعہ ۔ دہلی ...... "حضرت عزیز اک خوش ذوق، مستغنی المزاج، شگفتہ طبع اور مایہ وار شوکت زبان وبیان شاعر ہیں ۔ وہ داغ کے فنا فی الشیخ قسم کے شاگرد ہیں دہلوی لہجہ و محاورہ کا غیر متزلزل اتباع اِن کا ایک اور امتیاز ہے"

نقد سخن نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز نے حضرت فانی بدایونی کے کلام پر فنی نقطۂ نظر سے سخن ورانہ تنقید کی تھی ۔ یہہ تنقید مجلۂ طیلسانین میں شایع کی گئی اِس کے بعد اِدارہ کی جانب سے کتابی صورت میں شائع ہوئی ہے ۔ عسعم

نذر ولی ۔ اس میں دکن کی چار خواتین انشاپرداز محترمہ ج ، نقوی صاحبہ

محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ، محترمہ نعیم النساء بیگم صاحبہ اور محترمہ نجم النساء بیگم صاحبہ کے
دلچسپ مضامین ہیں جو بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی اور خصوصیاتِ
کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب میں اور جدید ترین نقطۂ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین
میں ولی کی معلومات، ان کے تخیل، ان کے فن شعر اور ذوقِ عرفاں کے علاوہ ان کا اسلوب
زبان اور انتخاب الفاظ کے متعلق بھی نہایت مفید اور دلچسپ بحثیں کی گئی ہیں۔ عالم
مشیر دکن۔ حیدر آباد .... "یہہ کتاب ترتیب اور زیادہ سلیقہ
کے ساتھ پیش کی گئی ہے، اس میں آدم ریختہ ولی اورنگ آبادی پر جامعۂ عثمانیہ کی
جماعت ام، اے کی چار نامدار النساء پرداز طالبات کی تحقیقی و تنقیدی مبسوط مقالے
درج ہیں جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہہ کافی محنت اور مطالعہ کے بعد لکھے گئے ہیں
ولی کی شاعری کا اس قدر تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے کہ ولی سے متعلق اس سے پہلے
ایسا مبسوط مضمون ہماری نظر سے نہیں گذرا ایک ایک عنوان پر سیر حاصل بحثیں
کی گئی ہیں یہہ مضمون بہت محنت سے لکھا گیا ہے اور قابل تعریف ہے۔
دوسرے مضمون میں صوفیانہ کلام پر بہت ہی قابلانہ اور ماہرانہ انداز میں نظر
ڈالی گئی ہے اور ایسے شعر پیش کئے گئے ہیں جو تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوے ہیں
تصوف کا ذوق رکھنے والوں کے لئے یہہ بہت دلچسپی کی چیز ہے۔
تیسرا مضمون ولی کی علمی وادبی معلومات اور خصوصیات شاعری ہے۔
چوتھا اور آخری مضمون ولی کی فن شاعری پر ہے۔ یہہ مضمون جو پچاس سے

زاید صفحات پر آیا ہے بڑے معرکہ کا مضمون ہے اس میں شاعر کے کلام کی خوبیوں کو گنایا گیا ہے اور شرح و بسط کے ساتھ کمال شاعری پر نظر ڈالی گئی ہے۔ غرض تذروی ایک ایسا نفیس ادبی تحفہ ہے جس کا ہر شایق ادب کے پاس ہونا از بس ضروری ہے اِس کتاب کے اشاعت کے لئے کارکنانِ اِدارہ قابل مبارک باد ہیں"

گریہ و تبسم صاحبزادہ میکش مدیر "سب رس" کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے میکش حیدرآباد کے نوجوان شعرا میں ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں اور اُن کا کلام بہت مقبول ہے۔ ڈاکٹر زور کا دیباچۂ عمومی اور پروفیسر عبدالقادر سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ عال

روزنامۂ پیام۔ حیدرآباد ......" صاحبزادہ میکش کا شمار اُردو کے ان نوجوان شعرا میں ہے جو اپنے شاعرانہ وجدان کو محض ادبیات تک محدود نہیں رکھتے بلکہ جنھوں نے اپنے لئے خیال و بیان کے کچھ نئے میدان بھی پیدا کر لئے ہیں۔ اِس شاعری کا "شباب" گل و بلبل سے گزر کر اِس حالت تک پہنچ گیا ہے جہاں نوجوان شاعر پکار اٹھتا ہے کہ :-

قرار بیقراریوں کا نام ہے شباب میں سکون زیست پا رہا ہوں عہد اضطراب میں

اِس "عہد اضطراب" آئینہ دار شاعری کا بہ حد بہ کتب ہے جس میں فکر و شعر اب "بعنوان دگر" ہے

"گریہ و تبسم" کے صفحات کا نصف سے زیادہ حصہ اِسی قسم کی شاعری ہے۔

اِس کے بعد ایک حصے میں جذباتی نظمیں ہیں جس میں بعض بعض بہت ہی خوب ہیں کتاب کے آخری حصے میں تھوڑا سا تغزل بھی ہے لیکن اس کا رنگ بھی "جدید" ہے اور "قدیم" نہیں ہے۔

نوجوانانِ حیدرآباد کی شاعری میں جو ذوق جدید پیدا ہو رہا ہے۔ اسی کا نقیب "گریہ و تبسم" ہے اور اِس نقطۂ نظر سے ہم اِن اوراق کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ جناب میکشؔ کا یہ ذوق کلام مقبول عام ہو گا۔"

مشاہیر قندھار دکن (با تصویر) از اکبرالدین صدیقی بی اے۔ قاضی زادہ پانگاؤں

۱۸۴ صفحات۔ ۹ تصاویر۔ قیمت عسم

اس کتاب میں دکن کے مشہور مردم خیز خطے قندھار شریف کے معزز خاندانوں اور ان کے باکمال اور مایۂ ناز افراد کا اجمالی تذکرہ پیش کیا گیا ہے جو سرزمین دکن میں صدیوں سے تصوف، عرفان علم و فضل اور شعر و سخن کے علمبردار رہے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ حیدرآباد کے صرف ایک تعلقہ سے کتنے زیادہ صاحبان فضل و کمال پیدا ہوے ہیں۔ اسی طرح اگر دوسرے مقامات کے متعلق بھی کتابیں لکھی جائیں تو دکن کی تاریخ کی تکمیل میں آسانی ہو سکتی ہے۔